ہفت روزہ
بادبان
لاہور پاکستان

ایڈیٹر: مجیب الرحمٰن شامی

قیمت: ۴ روپے

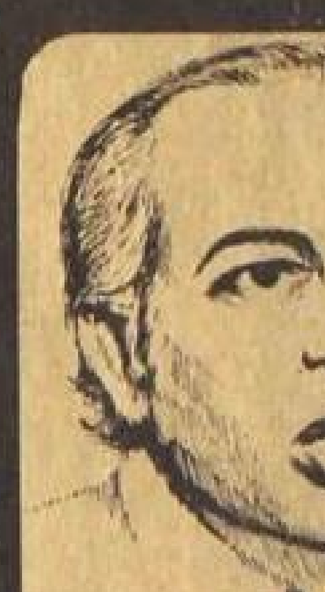
مسٹر بھٹو کا آخری سفر

ایک ایک لمحے کی رُوداد

— مکمل اور مفصل رپورٹ

کفن سر کاؤ

میری بے زبانی دیکھتے جاؤ



مَیں نے بھٹو کو

پھانسی چڑھتے دیکھا

پہلی چشم دید رپورٹ

قارئین کے بے پناہ اصرار اور بے پناہ مانگ کے پیش نظر گزشتہ ہفتے چھپنے والی رپورٹ ایک بار پھر

صفحہ ۳۹ پر ملاحظہ فرمائیں

واپسی

پاکستان قومی اتحاد نے وزارتوں سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ کر ہی لیا ــــ اب اس پر عمل درآمد کا انتظار ہے۔ ممکن ہے صدرِ پاکستان کی فرمائش پر چند دنوں یا چند ہفتوں کی تاخیر ہو جائے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ جب یہ سطور آپ کی نظر سے گزریں، تو اتحادی وزراء، سابق ہو چکے ہوں۔

قومی اتحاد کے اس فیصلے پر جو بھی رائے ظاہر کی جائے، اس نے یہ اعلان تو کر ہی دیا ہے کہ وزارتوں کی کوئی اہمیت اس کے نزدیک نہیں ہے۔ قومی اتحاد چاہتا تو اقتدار کی مہلت کو دراز کرنے کے بہانے تراش سکتا تھا، لیکن اس نے شریک حکومت ہونا ہی اس شرط پر منظور کیا کہ انتخابات کا انعقاد جلد سے جلد ہو ــــ اور، اب وہ واپس آیا ہے تو اس کے دامن میں جہاں اسلامی قوانین کے نفاذ کی مسرتیں ہیں، وہاں انتخابات کی تاریخ کا محکم اعلان بھی ہے۔ اور سچ پوچھیے، تو اس اعلان کے بعد قومی اتحاد کو حکومت سے الگ ہونا ہی تھا۔ بحث صرف چند ہفتے کی تقدیم یا تاخیر پر ہو سکتی ہے۔

قومی اتحاد کے ساتھ عرصۂ حکومت کے دوران کیا گزری ــــ؟ اسے کیا دشواریاں کہاں کہاں سے پیش آئیں، اور اس کے وزراء کو کیا ناکامیاں دیکھنی پڑیں، یہ ایک الگ بحث ہے ــــ لیکن اتنی بات بہرحال واضح ہے کہ اتحاد کے وزراء کو اقتدار سے الگ کرنے کے لیے عوام کو برسرِمیدان نہیں آنا پڑا، انہوں نے خود ہی بدلے ہوئے حالات میں اپنا نیا کردار متعین کیا اور اقتدار کے ایوان سے نکل کر برسرِمیدان آ گئے۔

مارشل لاء انتظامیہ پر اب حالات کو سنوارنے اور سنبھالنے کی مکمل ذمہ داری آن پڑی ہے ــــ اس کی کارکردگی کا ریکارڈ ایسا ہے کہ اس پر گفتگو کی گنجائشیں قدم قدم موجود ہیں، سخت تنقید بھی ابھرتی بھرتی ہے، اور اسے یکسر بے جا بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن گزرے ہوئے لمحات کے ماتم پر وقت صرف ہونے کے بجائے گذشتہ کوتاہیوں کی تلافی کر دی جائے، اہلِ مارشل لاء وطن عزیز کی سیاسی زندگی کو پاک صاف کرنے کے لیے سرگرم ہوں، احتساب کی کارروائی کو تیز سے تیز تر کر کے انتخابات کا راستہ ہموار کر دیں، تو پھر قرار آ ہی جائے گا۔

کسی ملک پر حکومت کرنے کا حق اس کے عوام ہی کو حاصل ہے۔ پاکستان کے تو خون میں جمہوریت ہے۔ یہ ووٹ کے ذریعے وجود میں آیا اور ووٹ ہی کے ذریعے مستحکم رہ سکتا ہے۔ پاکستان کے عوام کو اپنے حکمران چننے کا فطری اور پیدائشی حق حاصل ہے، اسے ان سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ انہیں ان کی ماؤں نے آزاد جنا ہے، انہیں کوئی غلام نہیں بنا سکتا ــــ بیلٹ کا دروازہ بند کرنے والے بلٹ کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ مسٹر بھٹو نے انتخابی دھاندلی کر کے 'فوجی انقلاب' کو گویا خود دعوت نامہ بھیج دیا تھا ــــ پاکستان میں بیلٹ کا دروازہ جلد از جلد کھلنا چاہیے، لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ یہ دروازہ بند کرنے والے، اس کے ذریعے اندر نہ آنے پائیں ــــ اور، آئندہ کوئی 'ووٹ یافتہ' بھی ووٹ کی طاقت سے انکار کرنے کی جرأت نہ کرنے پائے ــــ قانون کی بالادستی سے انکار نہ کر پائے۔

کیا آج کے حکمران اس سوال کا، اس اشکال کا کوئی مثبت جواب، کوئی مثبت حل اپنی جیب میں رکھتے ہیں، یا انہیں اس جواب کی تلاش ہے؟ ــــ اسی ایک بات پر مستقبل کا انحصار ہے۔ مستقبل اسی حوالے سے آج کے حکمرانوں کے بارے میں اپنی رائے متعین کرے گا ــــ اور، مستقبل پر آج کے قصیدہ خوانوں کا کچھ بس نہیں چلتا، کچھ بس نہیں چلے گا ــــ یحییٰ خان تو زندہ ہے، اسی سے پوچھ کر دیکھ لو!!! ●●

آئینہ

جلد : ۱ ، شمارہ : ۵۲
۱۴ اپریل ۱۹۷۹ء
قیمت : ۲ روپے

ایڈیٹر : مجیب الرحمٰن شامی
ڈپٹی ایڈیٹرز
سجاد میر ــــ مختار حسن ــــ ممتاز اقبال ملک
مستقل معاونین
ظہیر احمد ۔ سعود ساحر
شعبۂ کتابت
نذیر انور ۔ محمد نواز ۔ محمد یوسف ۔ یوسف عاجز ۔ امین بٹ

خصوصی تحریریں

مجیب الرحمٰن شامی پرنٹر پبلشر نے قومی پریس ۱۵، انارکلی لاہور سے چھپوا کر رانا چیمبرز پرانی انارکلی لاہور سے شائع کیا۔ فون نمبر: ۳۱۱۸۰۱

مسٹر بھٹو کا آخری سفر

آپریشن نوڈیرو

سعود ساحر

راولپنڈی سے لاڑکانہ تک

کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

۴ اپریل کا دن تیزی سے گزرتا جا رہا ہے۔ دن کے ہنگامے سمٹ رہے ہیں۔ دن بھر کی تھکی ہاری مخلوق نرم گرم بستروں میں نیند کے مزے لے رہی ہے، لیکن سرکاری طور پر ابھی تاریخ تبدیل نہیں ہوئی۔ رات کے گیارہ بجے ہیں۔ میں "جسارت" کراچی کو یہ خبر لکھا کر فارغ ہوا ہوں کہ صدر جنرل ضیاء الحق نواب محمد احمد خان کے قتل کے مجرم ذوالفقار علی بھٹو کی رحم کی اپیل مسترد کر چکے ہیں اور اب مجرم کو کسی بھی وقت پھانسی دی جا سکتی ہے۔ جس اعلیٰ افسر نے مجھے رحم کی اپیل مسترد ہونے کی خبر دی ہے وہ اس پوزیشن میں نہیں کہ پھانسی دینے کی قطعی تاریخ بتا سکے، تاہم اتنی بات میرے علم میں ہے کہ ہفتہ وار تعطیل سے ایک دن قبل اور ایک دن بعد کسی مجرم کو پھانسی نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے یہ نتیجہ میں خود اخذ کر لیتا ہوں کہ بھٹو کو پھانسی بدھ (۴ اپریل) یا اتوار (۸ اپریل) ہی کو دی جا سکتی ہے۔ یہ بات میں رات کو اپنی خبر (جسارت) میں، میں بھی لکھوا چکا ہوں، لیکن ذہنی طور پر مطمئن نہیں ہوں۔

عدم اطمینان کے بہت سے پہلو ہیں:

- ۳ اپریل کو **نصرت** بھٹو اور بے نظیر بھٹو، مرحوم ذوالفقار علی بھٹو سے طویل **ملاقات** کر چکی ہیں۔ یہ بھٹو کی قید کے دوران ماں بیٹی کی طویل ترین ملاقات ہے جو تین گھنٹے تک جاری رہی ہے۔
- ملاقات کے بعد ان دونوں ماں بیٹی کو جیل سے نکالنے کے لیے حکام نے جس عجلت اور مستعدی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ بھی ذہن کو کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا ہے۔
- بیگم نصرت اور بے نظیر بھٹو کے سہالہ پہنچنے کے بعد اُن کے ذاتی ملازمین کے سہالہ سے کہیں جانے پر پابندی لگا دی گئی ہے، جسے پیپلز پارٹی کے اخبارات ملازمین کی نظربندی سے تعبیر کرتے ہیں۔
- یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ آج بیگم نصرت بھٹو جیل سے بھٹو کی کتابیں اور دوسرا سامان لے گئی ہیں۔
- جیل حکام سے ٹیلی فون کے ذریعہ رابطہ ممکن نہیں رہا ہے۔ دوسری جانب ٹیلی فون اٹھانے والا کوئی نہیں ہے۔

٭ ٭ ٭

یہ ساری باتیں ایک ہی سمت اشارہ کرتی ہیں کہ وہ وقت نزدیک آ چکا ہے، جو خوش فہمیوں کے مارے لوگوں کے نزدیک تو ممکن نہ تھا۔ میرے لیے اس کشمکش سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے کہ مجھے قطعی بات معلوم ہو کہ موت کی سزا پر آج عمل درآمد ہو رہا ہے یا نہیں۔ میں ایک بار پھر کراچی فون کرتا ہوں۔ مدیر "جسارت" جناب محمد صلاح الدین سے کہتا ہوں کہ جناب میں جیل کی سمت جا رہا ہوں۔ پہلی بار خبر کے معاملے میں میرے ذرائع ناکام ہوتے نظر آتے ہیں یا میں صحیح ذریعے تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا، تاہم میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ کوئی بڑی خبر موجود ضرور ہے۔ جواب ملتا ہے: ہم آپ کے فون کا صبح تک انتظار کریں گے۔

٭ ٭ ٭

۱۲ بج چکے ہیں۔ سڑکیں سنسان پڑی ہیں۔ چاندنی چوک سے کمیٹی چوک تک کوئی انسان نظر نہیں آتا، حتیٰ کہ گشت کے سپاہی اور چوکیدار بھی نظر نہیں آ رہے۔ البتہ کمیٹی چوک پر رات بھر کھلے رہنے والے چائے خانے آباد ہیں جہاں ٹیکسی ڈرائیور سینما کا آخری شو ختم ہونے کے انتظار میں ان چائے خانوں کی آمدنی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ میرا سکوٹر کمان سے نکلے ہوئے تیر کی مانند اپنی منزل کی جانب دوڑ رہا ہے۔ مریڑ حسن کے قریب گشتی پولیس کی جیپ کھڑی ہے۔ اس کے ماتھے پر سرخ آنکھ روشن ہے۔ یہ معمول کے مطابق بات ہے۔ مجھے اپنے خدشات بے بنیاد نظر آتے ہیں۔ مریڑ حسن سے دائیں ہاتھ مڑتے ہی میرا گھر ہے۔ ایک لمحے کو میرا جی چاہتا ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کو برچھی کی طرح کاٹنے والی ہوا سے امان حاصل کرنے کی غرض سے گھر چلا جاؤں لیکن دل و دماغ کی اس کشمکش میں سکوٹر عقل ہی کی اطاعت کرتا ہے۔

پریذیڈنسی کے سامنے ایک فوجی ٹرک کھڑا ہے۔ انکم ٹیکس کے دفتر سے جونہی بائیں مڑتا ہوں، تو سامنے گشتی پولیس کی جیپ نظر آتی ہے۔ جیپ میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا پولیس افسر ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کرتا ہے۔ یہ غیر معمولی بات ہے۔ یوں راہ چلتی سواریوں کو روکنا گشتی پولیس کا معمول نہیں، لیکن مجھے آگے جانے کی اجازت دے دی جاتی ہے، اور ایک لمحے کو میرے دماغ میں پیدا ہونے والا خیال باطل قرار پاتا ہے۔

سیشن کورٹ کے سامنے سے بے نام سا موڑ مڑتے ہی غیر معمولی صورت حال کا احساس ہوتا ہے۔ ڈی سی آفس اور ایس ایس پی آفس میں روشنی ہے۔ خلاف معمول جیل کے صدر دروازے کا بلب بھی روشن ہے۔ اندر ڈیوڑھی میں بھی روشنی ہو رہی ہے۔ دور ہی سے جیل کی پیشانی پر "ڈسٹرکٹ جیل" صاف پڑھا جا سکتا ہے۔ مجھے بارہا رات کو یہاں سے گزرنے کا اتفاق ہوا ہے، روشنی کا یہ اہتمام کبھی نظر نہیں آیا۔ میں ڈسٹرکٹ کورٹ اور ڈسٹرکٹ جیل کے درمیان حائل پل پر رک گیا ہوں۔

دونوں طرف مسلح پولیس والے کھڑے ہیں۔ جیل کی دیوار کے ساتھ پولیس

کی سفید ٹیکسی وہیں کھڑی ہے۔ وردی پہنے ہوئے ایک پولیس والا میری جانب بڑھتا ہے۔ قریب آنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ پولیس کا ایک بڑا افسر ہے۔ مجھے ٹیکسی تک چلنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ ٹیکسی میں پولیس کے دو اعلیٰ افسر موجود ہیں۔ میری یہاں موجودگی کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ مسلح جوانوں سے بھرا ہوا ایک ٹرک ہمارے قریب سے گزر گیا ہے۔ یہ اسلام آباد سے ہوائی اڈے کی جانب سے آیا ہے اور صدر کے سیکرٹریٹ کی طرف چلا گیا ہے۔ اس کے عقب میں ایک ویگن ہے جس میں مسلح سپاہی سوار ہیں۔ یہ پولیس والے ہیں۔

پولیس کے دونوں اعلیٰ افسروں کا کہنا ہے کہ ہم معمول کے مطابق گشت پر ہیں، لیکن رات کے اس لمحے اتنے اعلیٰ حکام کا گشت معمول کے مطابق نظر نہیں آتا۔ بھٹو آٹھ ماہ سے ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں مقید ہیں۔ یہ اہتمام روز کا دستور نہیں، تاہم پولیس کے یہ اعلیٰ افسر میرے راستے میں مزاحم ہیں۔ اس سارے سفر اور گفتگو میں دس منٹ گزرے ہیں۔ ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی اندر سے میرا دیکھا بھالا ہے۔ پھانسی گھاٹ کی جگہ میرے ذہن میں ہے۔ موت کی کوٹھڑیوں کے محل وقوع کا مجھے اندازہ ہے۔ میں اس جیل کے اندر دو مجرموں کو پھانسی چڑھتے دیکھ چکا ہوں۔ اس سارے طریقۂ کار سے مجھے آگاہی ہے، جو کسی مجرم کو پھانسی چڑھانے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ وہ مختصر سا دروازہ میری نگاہوں کے سامنے ہے جو جیل اور پھانسی گھاٹ کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتا ہے۔

یہ دروازہ جیل سے ایک وسیع احاطے میں پہنچاتا ہے جہاں بائیں ہاتھ ایک کونے میں اینٹوں سے بنا ہوا وہ پلیٹ فارم ہے۔ جس کے درمیان موت کا کنواں ہے۔ جس کے اوپر ایک دوسرے سے مل کر دروازے کی طرح بند ہو جانے والے دو تختے لگے ہیں، جنہیں ایک لیور کے ذریعے ہی کھولا جا سکتا ہے۔ یہی موت کا لیور ہے جسے کھینچ کر تارا مسیح اور اُس کا خاندان نہ جانے کتنے مجرموں کو اب تک اُن کے انجام سے دو چار کر چکا ہے۔ یہ دونوں تختے بارہ فٹ گہرے ایک پختہ کنوئیں کے اوپر دروازے کی طرح بند ہوتے ہیں، اور لیور کھینچنے پر اندر کی طرف کھلتے ہیں۔ ان تختوں پر مجرم کو کھڑا کیا جاتا ہے۔

اب میرا رُخ اسلام آباد ایئر پورٹ کی سمت ہے۔ ڈیڑھ سو قدم کے فاصلے پر سابق ایف ایس ایف کے سابق ہیڈ کوارٹر کا آہنی گیٹ ہے۔ اس کے عین عقب میں پھانسی گھاٹ واقع ہے۔ یہاں بھی مسلح جوان پہرہ دے رہے ہیں۔ میں ایک لمحے کو یہاں رکتا ہوں، تو سامنے پھانسی گھاٹ کے دونوں بلب روشن نظر آتے ہیں۔ ایک بلب پھانسی کے پلیٹ فارم کے ساتھ پول پر لگا ہے، دوسرا جیل اور پھانسی گھاٹ کے درمیان حائل دروازے کے قریب ہے۔ اب یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ آج ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں کوئی مجرم اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے اور یہ بھٹو کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اب وہ ساری باتیں مربوط ہو کر ایک بڑی خبر کی جانب اشارہ کرتی ہیں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ میں عجلت میں "یوٹرن" لیتا ہوں اور پوری رفتار سے واپسی کا سفر شروع کرتا ہوں، لیکن اب دیر ہو چکی ہے۔ جیل کے گیٹ کے سامنے سڑک کے درمیان ایک باوردی جوان کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ ہے وہ مجھے رکنے کا اشارہ دے رہا ہے۔ یہ بڑے عرصے سے حفاظتی انتظام میں مصروف عملے کا رکن ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ تمام کام نہایت رازداری سے ہو جائے۔ میں رک جاتا ہوں۔ مجھے ہدایت کی جاتی ہے، میں سکوٹر بند کر دوں، اسے تالا لگاؤں اور چابی اس کے حوالے کر دوں۔ یہ جوان مسلح نہیں ہے، لیکن غیر معمولی طور پر چست اور مستعد ہے۔

میں اس سے اپنا تعارف کراتا ہوں، لیکن وہ کوئی بات سننے پر آمادہ نہیں ہے، اس کا رویہ مہذبانہ ہے، آواز میں کرختگی نہیں، لیکن وہ سختی کے ساتھ اپنے ساتھ چلنے کو کہتا ہے۔ اس کا عزم اس کی آواز سے ظاہر ہو رہا ہے۔ میرے ساتھ ایک اور اخبار نویس جناب ضمیر نفیس ہیں، دوسری موٹر سائیکل پر نوجوان صحافی جناب قریشی ہیں۔ ہم دونوں چابیاں اس جوان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اس کے عہدے کا پتہ چلانا ممکن نہیں ہے کہ اس نے وردی پر زپ والی جیکٹ پہنی ہوئی ہے۔ ہم دوبارہ اس آہنی گیٹ کی جانب جا رہے ہیں، جہاں سے پھانسی گھاٹ کا بلب جلتا ہوا صاف نظر آتا ہے۔ ہمیں دروازے کے ساتھ ایک بنچ پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ جوان گیٹ کے اندر چلا گیا ہے۔

اب میں مطمئن ہوں، میری خبر کی تصدیق ہو چکی ہے۔ اپنی حراست کا مطلب سمجھ میں آ چکا ہے۔ بس ایک خلش ہے۔ دوسرے ساتھی آزاد ہیں، اپنے دفتروں تک پہنچنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ مگر میرا دفتر خدا جانے کب میرے حراست میں لیے جانے سے باخبر ہو گا۔ میں سب سے پہلے خبر کی تصدیق کرنے کے باوجود مات کھا گیا ہوں، لیکن اس میں میری کوتاہی نہیں ہے۔

* * *

میرے ذہن میں ماضی کی فلم چل رہی ہے۔ میں ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو گیا ہوں:

غسل میت

چار اپریل کو چار بجے شام پولیس نے مولانا غلام غوث ہزاروی کی مسجد کے خادم حیات محمد سے رابطہ قائم کیا۔ انہیں کہا گیا کہ ایک میت کو غسل دینے کے لیے انہیں ساتھ چلنا ہے۔ رات نو بجے حیات محمد کو تھانے لے جایا گیا اور وہ ایک گھنٹہ بعد ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی پہنچا دیئے گئے۔ اُن کا کہنا ہے کہ انہیں ایک کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ آدھی رات کے بعد ایک اور کوٹھڑی میں لے جایا گیا، وہاں ایک مدھم بلب جل رہا تھا۔ ایک میت رکھی تھی اور اُسے غسل دینے کا اہتمام تھا۔ حیات کے بقول مجھے معلوم نہیں تھا یہ کس کی میت ہے۔ جب میں نے میت کے منہ پر سے چادر سرکائی تو پتہ چلا کہ یہ بھٹو کی نعش ہے۔ میں نے میت کو غسل دیا اور کفن پہنایا۔ بھٹو کی شیو تازہ تازہ بنی تھی۔ اس وقت بھٹو کے جسم پر شلوار اور قمیض تھی۔ غسل دیتے ہوئے میں نے دیکھا کہ بھٹو کے گلے کے ارد گرد لپٹے ہوئے رسیوں کے نشان تھے اور گردن لمبی ہو چکی تھی۔

میں اپنا فرض ادا کر چکا تو جیل حکام نے چالیس روپے ادا کر کے مجھے فارغ کر دیا۔ معلوم ہوا ہے کہ بھٹو کے لیے کفن مدینہ بازار کی ایک دکان شیخ کلاتھ ہاؤس سے خریدا گیا۔ تھانہ چھاؤنی کے ایک انسپکٹر کفن خریدنے آئے۔

• اسلام آباد کی کشادہ اور شفاف سڑک ہے۔ اسے خیابانِ سہروردی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ۱۲ اپریل ۷۲ء کی ایک روشن صبح ہے۔ شاغ شان کی ویرانی کا اہتمام ہے ــــ جناب الطاف حسن قریشی، ان کے بھائی ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اور جناب مجیب الرحمٰن شامی سول مارشل لاء کے اسیر ہیں ــــ "اردو ڈائجسٹ" اور "زندگی" پر پابندی ہے۔ جناب مختار حسن، شیخ وثیق احمد، اظہر مرزا شہید، افضل مرزا اور چند دوسرے ساتھیوں کے ساتھ صحافت کے ان قافلہ سالاروں کی رہائی کا مطالبہ کرنے اسلام آباد پہنچتا ہوں۔ تحریکِ استقلال کے ظفر علی شاہ بھی اپنے گنتی کے کارکنوں کے ساتھ مشرقی پاکستان کے لیے ماتم کناں ہیں۔ ابھی ایس ایف ایس وجود میں نہیں آئی۔ پیپلز گارڈ کے "جیالے" پولیس کے سائے میں "تڑپنے اور فریاد کرنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ لیکن میرے ساتھیوں کے تیور بھی نرالے ہیں۔ ہر حال میں اسمبلی کی عمارت تک جانے کا عزم رکھتے ہیں۔ اور ایم این اے ہوسٹل تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں ڈاکٹر نذیر شہید موجود ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "نوجوانو! میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں لے کر اسمبلی تک پہنچ جاؤں گا۔ پولیس کی لاٹھیاں پہلے مجھے پڑیں گی"۔

• منظر تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔ لیاقت باغ کا وسیع میدان ہے۔ ۲۳ مارچ کی تاریخ ہے۔ ہزاروں افراد جمع ہیں۔ جمعہ کی نماز ہو چکی ہے۔ دو بج رہے ہیں۔ چاروں طرف سے گولیاں برس رہی ہیں۔ انسان بھونے جا رہے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں موت کی ایسی ارزانی یا تو ۱۹۴۷ء کے فسادات میں دیکھی ہے یا آزاد پاکستان میں ۲۳ مارچ ۱۹۷۳ء کو لیاقت باغ میں۔

• کاروں کا ایک طویل قافلہ ہے۔ مئی ۷۵ء کی کوئی تاریخ ہے۔ یہ قافلہ آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد کی جانب جا رہا ہے۔ اس کی قیادت کشمیر کے عظیم قائد سردار محمد عبدالقیوم خان کر رہے ہیں۔ دلائی پُل پر اس قافلے کو روک لیا جاتا ہے۔ ایف ایس ایف کے جوان محبِ وطن پاکستانیوں کو اپنی رائفلوں سے زیر کرنے کے لیے آئے ہیں۔

• مظفر آباد کا گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس ہے۔ ایف ایس ایف کا ایک کمانڈر چیخ چیخ کر مجھے کیمرے سے فلم نکالنے کا حکم دے رہا ہے جس سے میں انکاری ہوں۔ وہ مجھے بُرے انجام کی دھمکی دیتا ہے۔

• لاہور کے تاج پورہ گراؤنڈ میں لاکھوں انسان جمع ہیں حلقہ نمبر ۶ کا ضمنی انتخاب ہونے والا ہے۔ لوگ ایک اُمیدوار کی تقریر سُننے آئے ہیں۔ یکا یک گولیوں اور آنسو گیس کی زد میں آجاتے ہیں۔ موت کے فرشتے کی مصروفیات بڑھ جاتی ہیں۔ واقعات کا تسلسل ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔

ایک آواز مجھے چونکا دیتی ہے۔ مجھے چلنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔

اب میں پولیس کی تحویل میں ہوں۔ ڈیڑھ بج رہا ہے ضمیر نفیس کہتا ہے: سعود ساحر! کھیل ختم ہو رہا ہے، اب ہمیں کیوں روکا جا رہا ہے۔ ہمیں ایک کمرے میں بیٹھنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ پولیس افسر کا رویہ نہایت خلیقانہ ہے۔ وہ مجھے کہتا ہے: آپ چلئے بیٹھیں گے۔ اس وقت آپ کی کیا خدمت کی جائے؟ ہمارا ایک ہی مطالبہ ہے کہ ہمیں جانے کی اجازت دے دی جائے جو غالباً اس پولیس افسر کے بس میں نہیں ہے۔

ہم کمرے کے اندر ہیں۔ لیکن دروازے کھلے ہیں، کچھ لوگ محوِ خواب ہیں، پولیس افسر ہمیں کمرے میں چھوڑ کر جا چکا ہے۔ ایک باوردی آدمی جاگ رہا ہے۔ فضا کا سکوت، عملے کی پراسرار سرگرمیاں، دبے دبے قدموں کی آہٹ بہت کچھ باور کرا رہی ہے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ انجام کی گھڑیاں نزدیک ہیں۔ اُڑتی اُڑتی باتیں کانوں میں پہنچ رہی ہیں، ہم خاموش ہیں۔ ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہیں، ہم زیادہ سے زیادہ سُننا چاہتے ہیں۔

پتہ چلتا ہے بھٹو غنودگی کے عالم میں ہیں۔ جیل کا عملہ انہیں وقت گزر جانے کا احساس دلاتا ہے۔ بھٹو جو ایک دن قبل جیل کے عملے کی جانب سے اس اطلاع کو اعصاب شکنی کا ایک حربہ سمجھتے ہیں کہ انہیں ۴ اپریل کو پھانسی دے دی جائے گی، اور وصیت لکھ کر پھاڑ دیتے ہیں۔ اب اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ انہیں وصیت لکھنے کی مہلت دی جائے۔ لیکن انہیں بتایا جاتا ہے کہ اس کا وقت گزر چکا۔ اب یہ مہلت ملنا ممکن نہیں رہا۔ بھٹو کے ساتھ یہ رعایت کی گئی ہے، کہ انہیں پھانسی پانے والوں کا مخصوص چُست لباس نہیں پہنایا گیا، بلکہ وہ اپنی شلوار قمیص میں ملبوس ہیں۔ ان کے ہاتھوں کو پُشت کی جانب کرکے ہتھکڑی لگا دی گئی ہے۔

اب بھٹو کو یقین آ چکا ہے۔ اگلی صبح کا سُورج دیکھنا ان کے مقدر میں نہیں ہے۔ وہ سکتے کے عالم میں ہیں۔ ماضی کا روشن دور دھندلی پرچھائیں کی طرح ان کی نگاہوں کے سامنے ہے، پتہ چلتا ہے، بھٹو یقین کی اس منزل میں بے ہوش ہو گئے ہیں۔ بھٹو کے آبائی گاؤں کے نام سے منسوب آپریشن ــ آپریشن نوڈیرو ــــ کے نگران ذوالفقار علی بھٹو کو سٹریچر پر ڈال کر پھانسی کے پلیٹ فارم پر لے جاتے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ جیل چوہدری یار محمد، دونوں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹس، جیل کے ڈاکٹر صغیر، مقامی مجسٹریٹ بشیر احمد خان اور آئی جی جیل خانہ جات چوہدری نذیر اختر یہاں موجود ہیں۔ لال ٹوپیوں والا جیل کا عملہ جو اچھے رتبے کے حامل طویل مدت کے قیدیوں پر مشتمل ہوتا ہے، بڑی تعداد میں موجود ہے۔ تلاوتِ کلامِ پاک سے جیل کی فضا گونج رہی ہے، لال ٹوپیوں والے جمعدار تلاوتِ کلامِ پاک میں مصروف ہیں۔ تلاوتِ کلامِ الٰہی کرنے والے موت کے پلیٹ فارم کے گرد بھی کھڑے ہیں کہ یہی جیل کا دستور ہے۔

انہیں (بھٹو کو) چلنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ وہ کوٹھڑی سے باہر نکلنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ یہ موت سے بچنے کی خواہش کی علامت ہے۔ لبوں پر کلام اللہ کے مقدس حروف سجائے اور ہاتھوں میں بھٹو صاحب کا سٹریچر اٹھائے لال ٹوپی والے اسی دروازے کی طرف جا رہے ہیں جو پھانسی گھاٹ کی جانب کھلتا ہے۔

سٹریچر کو اسی پختہ پلیٹ فارم پر رکھ دیا گیا ہے۔ جسے موت کے چبوترے کے نام سے ہی یاد کیا جا سکتا ہے۔ پھانسی کا پھندا تیار ہے۔ تارا مسیح ڈیڑھ اِنچ قطر کے رسّے کو پول سے باندھ چکا ہے۔ اس کی مخصوص گرہ لگائی جا چکی ہے، اور اسے کھینچ کر دیکھا جا چکا ہے۔ اس کی کارکردگی کا اندازہ لگایا جا چکا ہے۔ سکوت قلب میں دلوں کی دھڑکنیں اور کلام اللہ کے الفاظ کے سوا کچھ سُنا نہیں جا سکتا۔ یہاں تمام احکامات اشاروں سے دیے جاتے ہیں۔ زبان کا استعمال کم ہی ہوتا ہے، البتہ مجرم کے بولنے پر کوئی پابندی نہیں ہوتی، نہ اسے زبان استعمال کرنے سے روکا جاتا ہے۔

بھٹو صاحب کو تختوں پر کھڑا کیا جا چکا۔ تارا مسیح سیاہ نقاب ان کے منہ

پر چڑھا رہا ہے، یہ آخری لمحات ہیں۔ انہی لمحات میں مجرم کی جانب سے اس خواہش کا اظہار ہوتا ہے کہ بازوؤں پر بندھی ہوئی رسی تکلیف دے رہی ہے اسے ذرا ڈھیلا کر دیا جائے، رسی ڈھیلی کر دی جاتی ہے۔ ان کے گلے میں پھندا ڈالا جا چکا ہے۔ دونوں پیروں کو ملا کر تسلی باندھی جا چکی ہے، تارہ مسیح تختوں سے اتر آیا ہے، اور اب اس لمحے کا منتظر ہے، جب سپرنٹنڈنٹ جیل ہاتھ کے اشارے سے لیور کھینچنے کا حکم دیں گے۔ ایک افسر جو چبوترے پر کھڑا ہے سرگوشی میں بھٹو صاحب کو بولنے سے منع کر رہا ہے، یہ اس اندیشے کے تحت کیا جاتا ہے کہ کہیں مجرم کچھ کہہ رہا ہو اور لیور دبا جائے، تو زبان دانتوں کے درمیان آکر بھنچ جاتی ہے۔

سوئی دو بجا کر گیارہ منٹ پر پہنچتی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل کی نظریں اپنی ریڈیم ڈائل کی گھڑی پر ہیں۔ یکایک وہ سر اٹھاتے ہیں، ان کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گرتا ہے۔ یہ اشارہ ہے لیور دبانے کا۔ تارہ مسیح کا منحنی سا ہاتھ لیور کھینچ دیتا ہے۔ دونوں تختے ایک آواز کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں، اور بارہ فٹ گہرے کنویں میں اندر کی جانب کھلتے ہیں۔ ایک انسان جو ایک عہد کا بانی تھا۔ اپنی طرز کے عہد کا اپنے پورے عہد اور اپنی افتادِ طبع کے ساتھ خاموشی سے موت کی گرفت میں چلا جاتا ہے۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر،

٭ ٭ ٭

تلاوت کی مدہم آوازیں ذرا بلند ہو جاتی ہیں، کچھ لوگ بلند آواز میں کلمہ طیبہ پڑھ رہے ہیں۔ قاعدے کے مطابق کئی منٹ انتظار کرنا ہے۔ یہ وقت بھی گزر ہی جاتا ہے کہ برس بیت جاتے ہیں، بیت گئے ہیں، ڈاکٹر ایک ڈھلان سے گزر کر اس کنویں میں جاتے ہیں، جہاں رسی کے ساتھ نعش لٹک رہی ہے۔ لال ٹوپی والا ایک جمعدار نعش کے قریب ایک کرسی رکھ دیتا ہے۔ جیل کا ڈاکٹر کرسی پر کھڑا ہو کر نعش کا معائنہ کر رہا ہے۔ سٹیتھو سکوپ لگا کر دل کی حرکت جانچ رہا ہے، ایک ہاتھ نبض پر ہے، اس کی نبض پر جس کا دعویٰ تھا کہ وقت کی نبض پر میرا ہاتھ ہے۔

۲ بج کر ۳۵ منٹ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر کنویں سے باہر آکر بھٹو کی موت کا اعلان کرتا ہے، جس کا عملہ اپنے کام میں مستعد اور ماہر ہے۔ نعش لمحوں میں اتار لی جاتی ہے۔ اب نعش کو دوبارہ سٹریچر پر ڈالا جا رہا ہے۔ نسخہ کیمیا کی تلاوت جاری ہے۔ سٹریچر اب اس مخصوص سیل میں لے جایا جا رہا ہے، جو ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی کے زنانہ بلاک میں خاص طور پر بھٹو صاحب کے لیے بنایا گیا تھا۔ یہ تین کمروں کا سیل ہے جس میں غسل خانہ بھی موجود ہے اغسل خانے میں میت کو غسل دینے کا اہتمام کیا گیا ہے، اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بھٹو صاحب نے پھانسی سے قبل نہانے سے انکار کر دیا تھا۔

٭ ٭ ٭

بھوسہ منڈی صدر میں واقع جامع مسجد رجس کے امام بھٹو صاحب کے پرانے سیاسی حلیف غلام غوث ہزاروی ہیں، کے خادم حیات محمد کو اسی مقصد کے لیے خاص طور پر جیل لایا گیا ہے۔ حیات محمد کو یہ علم نہیں کہ وہ کس کی میت کو غسل دینے جا رہا ہے۔

پونے تین بج رہے ہیں۔ ایک فوجی ٹرک ڈسٹرکٹ جیل کے دروازے سے اندر جا رہا ہے، جہاں بھٹو صاحب کی میت کو غسل دیا جا رہا ہے، وہاں دو تابوت پڑے ہیں۔ ان میں سے ایک کا رنگ سیاہ ہے۔ ساڑھے تین بج رہے ہیں۔ خادم حیات محمد اپنے کام سے فارغ ہو چکے ہیں۔ تابوت کو ٹرک میں رکھا جا رہا ہے، مسلح، مستعد اور چاق و چوبند جوان ٹرک میں سوار ہو رہے ہیں۔ جیل کے دونوں دروازے کھول دیے گئے ہیں۔ ٹرک تیزی سے جیل سے نکلتا ہے اور دائیں ہاتھ مڑ کر اسلام آباد ائیر پورٹ کی جانب روانہ ہو جاتا ہے، جیل کے عملے کی ذمہ داریاں ختم ہوئیں، کھیل ختم ہو گیا، ایک جہاز ہمارے سروں پر سے گرجتا ہوا گزر گیا۔

ایک پولیس افسر اس کمرے میں داخل ہو رہا ہے، جہاں ہمیں رکھا گیا ہے، ساڑھے چار بجے ہیں، پولیس افسر ہم تینوں اخبار نویسوں سے کہتا ہے: "آپ کے لیے چائے بن رہی ہے۔" میں ان سے استفسار کرتا ہوں کہ ہمارے بارے میں کیا فیصلہ ہے، ہمیں کب تک یہاں رہنا ہے۔ جواب ملا: "اس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا، آپ کو چائے ضرور پلا سکتا ہوں۔ آپ کے یہاں رہنے یا جانے کا فیصلہ تو اعلیٰ حکام ہی کر سکتے ہیں، مجھے بھی اس فیصلے کا انتظار ہے۔"

صبح صادق کے آثار ہیں، میرے ذہن میں خیالات کا ہجوم ہے۔ عجیب بے ربط سے تصورات میں گھرا ہوں، لیکن میرا ذہن ان میں فطری رابطہ تلاش کرنے میں مصروف ہے۔ میرے ذہن میں علی پور فراشش میں ایک خاندان کو زندہ جلا دینے اور پھر اسی ڈسٹرکٹ جیل پنڈی میں بیک وقت پھانسی پر لٹکنے والے نو قاتلوں کا تصور ہے، لاہور کے ببو کے قاتلوں کا تصور ہے، جنہیں میں نے اپنی آنکھوں سے پھانسی چڑھتے دیکھا ہے، اور مشرقی پاکستان کا تصور ہے، مشرقی پاکستان کی یاد شدید ہو گئی ہے، سنہرے دیش کی یاد جسے میں نے کبھی دیکھا نہیں، لیکن ایک یاد ہے کہ سینے میں نیزے کی انی بن گئی ہے۔

باہر روشنی پھیلتی جا رہی ہے۔ کمرے میں جلنے والا بلب غیر ضروری شے بن کر رہ گیا ہے۔ پولیس افسر کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ بھٹو دور کا کوئی واقعہ بیان کر رہا ہے جو کچھ یوں ہے: جب سربراہِ مملکت اپنی قیام گاہ سے کہیں جانے کے لیے باہر نکلتا ہے، تو پولیس کے تمام وائرلیس سیٹ خاموش ہو جاتے ہیں اور صرف مختلف مقامات سے اس کے گزرنے کی اطلاع اگلے پوائنٹ کو دی جاتی ہے۔ یہ دلچسپ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ جب بھٹو ایوانِ صدر سے نکلتے تھے، تو کوئی نامعلوم آدمی پولیس کے عملے سے وائرلیس پر

قبرستان

بھٹو کا آبائی گاؤں نوڈیرو ہے، جہاں وہ عیدالفطر اور عیدالاضحٰی کے مواقع پر جاتے، تو گڑھی حبیب بخش میں اپنے آبائی قبرستان بھی ضرور جاتے اور اپنے والد اور دوسرے اعزہ و اقرباء کی قبروں کی زیارت کرتے۔ آج وہ بھی وہیں دفن ہیں، اور بہت سے لوگ ان کی قبر کو دیکھنے جا رہے ہیں۔ گڑھی خدا بخش میں بہت سی قبریں ہیں۔ بھٹو کے والد سر شاہنواز بھٹو کی قبر کے ساتھ ان کے سوتیلے بھائی امداد علی بھٹو کی قبر ہے۔ اس کے ساتھ ذوالفقار علی بھٹو کی قبر بنائی گئی ہے، پھر دیوار ہے، اس قبرستان میں بھٹو کی والدہ خورشید بیگم کی بھی قبر موجود ہے۔ ان کے ایک سوتیلے بھائی بھی وہاں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ قبرستان کا انتظام بھٹو خاندان کے سپرد ہے، جہاں ان دنوں حفاظتی انتظامات کیے گئے ہیں

بد زبانی کرتا تھا، لیکن بھٹو دور میں اس کا سراغ نہیں لگایا جا سکا تھا۔

صبح کے سات بج چکے ہیں، دن نکل آیا ہے۔ تابوت لے جانے والے جہاز کو کہیں دور فضاؤں میں گم ہوتے مدت ہو چکی ہے، مگر ہمارے ناکردہ گناہ کی سزا ابھی ختم نہیں ہوئی۔ انسپکٹر پولیس ملک شبیر کمرے میں داخل ہو کر کہتے ہیں کہ آئیے حضرات آپ کے لیے ناشتہ تیار ہے، ہم بی بی سی پر صبح کی خبریں سن چکے ہیں۔ بی بی سی کا مارک ٹیلی سب سے بڑی خبر کے محاذ پر مات کھا چکا ہے وہ جس کے باخبر ہونے کا ایک زمانے میں شہرہ ہے، وہ جسے فلیشمین ہوٹل میں بیٹھے ہوئے ڈیڑھ میل دور لیاقت باغ میں پاکستان کا پرچم نوچ پھینکنے کا بے بنیاد واقعہ بھی نظر آجاتا ہے، سات بجے کی خبروں میں کہتا ہے کہ بھٹو کے بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ جھوٹ کا بادشاہ سچ کے محاذ پر شکست کھا گیا!!

اب ہمیں باہر جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ میں باہر کی طرف بھاگتا ہوں۔ میرے دونوں ساتھی بھی عجلت میں ہیں۔ سنتری مستعد کھڑا ہے۔ میرا سکوٹر بھی موجود ہے۔ جیل کے دروازے کے سامنے بی بی سی کا مارک ٹیلی اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ ہے، "جنگ" کے زیڈ یو خان ہیں، اور "نوائے وقت" کے صفدر عباس بھی۔ پولیس کا سخت پہرہ جیل کے سامنے سے ہٹا لیا گیا ہے۔

مارک ٹیلی ہماری جانب بڑھتا ہے اور گورا شاہی اردو میں پوچھتا ہے "آپ کے ساتھ کیا ہوا؟"

کم از کم میرے ساتھ کچھ نہیں ہوا، میرا جواب تھا۔

"آپ کتنی دیر اندر رہے؟"

میں نے جواب دیا: خود تمہارے ساتھ کیا ہوا، تم تو اندر نہیں تھے۔ تمہیں اتنی بڑی خبر کیوں نہیں مل سکی؟

کون سی خبر؟ کھسیانا جواب تھا۔

"تمہارے عزائم اور خواہشات کو میں جانتا ہوں مسٹر مارک ٹیلی، تم اب میری خبر بنانے کی کوشش نہ کرو اور اس حوالے سے اپنی شکست پر پردہ نہ ڈالو۔ تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی!"

"اور تمہاری بات میری پوری قوم کی سمجھ میں نہیں آ رہی، مسٹر مارک ٹیلی"

لاڑکانہ سے خصوصی رپورٹ

پونے چار بجے صبح ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ کے فون کی گھنٹی بجی، انہوں نے خود فون اٹھایا۔ اطلاع ملی "پھانسی ہو گئی لاش سات بجے تک لاڑکانہ پہنچ رہی ہے۔ اسے دفن کرنے کا مناسب بندوبست کر لیا جائے"۔ چار بج کر بیس منٹ پر انتظامیہ نے میر پیر بخش بھٹو کو جو بھٹو خاندان کے سردار ہیں، اطلاع دی کہ بھٹو کی لاش آ رہی ہے جس پر وہ رونے لگے۔ انہوں نے میر پور بھٹو میں سردار نبی بخش بھٹو کو اطلاع دی کہ بھٹو کو پھانسی دی جا چکی ہے اور اس کی لاش بہت جلد پہنچنے والی ہے۔ وہ پہلے ہی باخبر تھے۔ اس کے بعد بھٹو کی پہلی بیوی کو نوڈیرو میں اطلاع دی گئی کہ بھٹو کی لاش آ رہی ہے، جسے آپ کی خواہش کے مطابق آپ کے آبائی قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ انہوں نے دیگر عزیزوں کو فوری طور پر اطلاع دے دی۔ چھ بجے صبح سے پہلے شیریں امیر بیگم، سردار نبی بخش بھٹو اور سردار پیر بخش بھٹو کے علاوہ بھٹو خاندان کے تمام لوگوں کو بھٹو کو پھانسی دیے جانے اور اس کی لاش گڑھی خدا بخش پہنچائے جانے کی اطلاع مل چکی تھی، جس پر بھٹو خاندان کے تمام مرد اور عورتیں سات بجے تک گڑھی خدا بخش میں جہاں بھٹو کا ایک بنگلہ ہے اور جو ان کے ددھیال کا گاؤں ہے ــــ ان کے تمام اہلِ خاندان اور بیشتر دوست احباب جمع ہو چکے تھے۔ بھٹو کے اکثر ملازمین بھی وہاں موجود ہیں۔

⁂

بھٹو کی لاش لے کر پاک فضائیہ کا طیارہ سات بج کر کچھ منٹ پر جیکب آباد اترا۔ وہاں دو ہیلی کاپٹر پہلے سے تیار کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک میں میت رکھ دی گئی، دوسرے میں کچھ حفاظتی عملہ سوار ہو گیا۔ ساٹھ میل کا سفر طے کرنے کے بعد یہ ہیلی کاپٹر آٹھ بجے سے چند منٹ پہلے گڑھی خدا بخش کے قریب نو تعمیر شدہ ہیلی پیڈ پر اتر گئے۔ لاش ہیلی کاپٹر سے آٹھ بج کر پانچ منٹ پر نکالی گئی اور وہاں سے ایک عام گاڑی میں منتقل کر کے بھٹو کے قدیم گھر کے سامنے لے جا کر تابوت نکالنے لگے، مگر اس موقع پر بھٹو خاندان کے بعض لوگوں نے میت گھر کے صحن میں لے جانے کی اجازت طلب کی۔ انتظامیہ کے بعض حکام پہلے اندر گئے اور غالباً جگہ کا معائنہ کرنے کے بعد باہر آ کر لاش اندر لے جانے کی اجازت دے دی۔ یہاں بھٹو کی لاش ایک بڑے پلنگ پر رکھ دی گئی۔ اس پلنگ پر وہ کبھی کبھار بیٹھا کرتے تھے۔ اس وقت عام کچہری بھی لگی رہتی۔ عوام کے مسائل حل ہوتے اور مشکلات رفع ہوتیں۔ اس پلنگ کو وہاں موجود چند افراد نے اٹھا کر اندر پہنچا دیا، اس وقت میت کو اہلِ خاندان کے حوالے کر دیا گیا تھا، اور بھٹو کا چہرہ آخری بار دیکھنے کے لیے کھولا گیا۔ تابوت میں کچھ پھول پڑے ہیں۔ جن سے فضا معطر ہو رہی ہے۔ خواتین نے لاش کو دیکھتے ہی بلک بلک کر رونا شروع کر دیا، بعد میں مرد بھی دھاڑیں مار کر روتے دکھائی دیے۔

⁂

آٹھ بج کر ۳۰ منٹ پر دفن کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ اس کام پر بھٹو کے ایک منشی اور فارم کے مینجر کو مقرر کیا گیا۔ تدفین کے لیے کچھ ضروری سامان لینے کے لیے نوڈیرو میں ایک دکان بطورِ خاص کھلوائی گئی۔ اس وقت عام طور پر گڑھی خدا بخش میں دوکانیں نہیں کھولی جاتیں۔ بعد میں جب بھٹو کی لاش آ جانے کی اطلاع ملی، تو گڑھی خدا بخش اور نوڈیرو میں دوکانیں اور دوسرے کاروبار بند رہے نو بجے تک قبر کی تیاری مکمل کر لی گئی۔ بھٹو کی آخری آرام گاہ، قبرستان کی باؤنڈری کی دیوار کے ساتھ منتخب کی گئی۔

جب قبر تیار کر لی گئی، تو سوا دس بجے گھر سے میت کو اسی پلنگ سمیت اٹھا لیا گیا۔ اس موقع پر بعض خواتین نے آخری دیدار کی خواہش ظاہر کی۔ پلنگ پھر رکھ دیا گیا۔ اس موقع پر خواتین دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ وہاں ہر آنکھ اشکبار تھی۔ بعض لوگوں نے بوسہ بھی دیا۔ میت پر آبِ زم زم اور عرق گلاب چھڑکا جا رہا تھا۔ وہاں سے لاش ایک قریبی مسجد میں پہنچا دی گئی۔ جو مسٹر بھٹو نے تعمیر کرائی تھی۔ اس کا دروازہ تنگ ہونے کے باعث میت کو مسجد کے اندر نہ پہنچایا جا سکا تاہم مسجد کے قدیم حصے میں میت رکھ کر نمازِ جنازہ کی تیاری کی جانے لگی۔ مولوی محمود علی بھٹو نے نمازِ جنازہ پڑھائی، جس میں بھٹو خاندان، ان کے دوستوں اور قرب و جوار کے سینکڑوں عوام نے شرکت کی۔ مسٹر بھٹو کو ساڑھے دس بجے سپردِ خاک کر دیا گیا۔

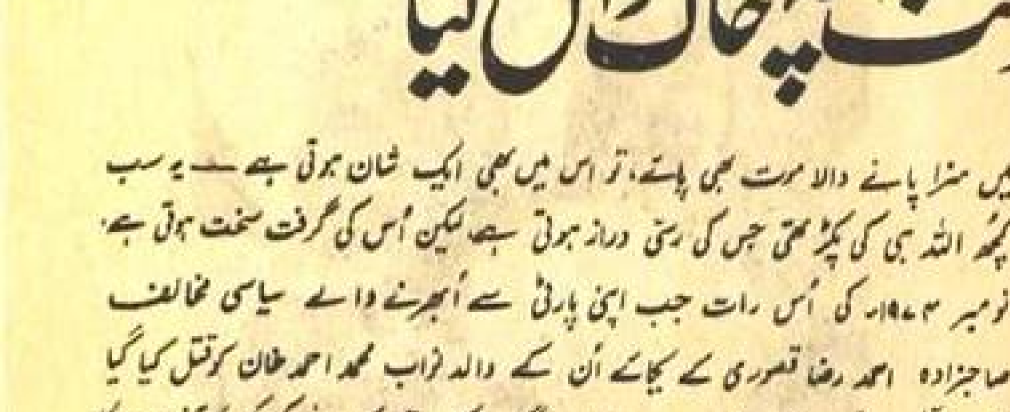


چار بھیانک منصوبے

آپریشن "شوگر کینیڈی"
آپریشن تاج پورہ
آپریشن اسمبلی بلڈنگ
آپریشن پیلی بلڈنگ

یہ کون بول رہا تھا خدا کے لہجے میں
یہ وقت کس کی رعونت پہ خاک ڈال گیا

بھٹو کو پھانسی ہو گئی، آخری دنوں میں بھٹو نے اپنے حق میں رحم کی جو بالآخر اپیلیں کروائیں وہ رحم کی اپیلیں کم اور عدالت کے خلاف صدرِ مملکت سے شکایت زیادہ تھیں، انہیں نامنظور ہونا ہی تھا، پاکستان قومی اتحاد کی ۰۰۰ کی انتخابی مہم میں بھٹو کو اُس کے اجتماعی جرائم 'سقوطِ مشرقی پاکستان' ۱۹۷۱ء کی جنگ میں مشکوک کردار، ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہندستان سے شکست کا اہتمام کروانا، اقوامِ متحدہ میں متحدہ پاکستان کے حق میں جنگ بندی کی قرارداد کو پھاڑ پھینکنا، اقتدار پر دوبارہ قبضے کے ساتھ دُشمن کے منصوبے کے عین مطابق ملکی معیشت پر ضرب کاری، عوامی خزانے کی لُوٹ، مزدوروں پر فائرنگ، سیاسی قتل و غارت، سیاسی مخالفین کے انفرادی قتل اور عوام کے قتلِ عام کی پے در پے وارداتوں کی بناء پر پھانسی لگانے کے نعرے لگے تھے۔ یہ زبانِ خلق تھی، اب نقارۂ خدا بنی اور بھٹو نے پھانسی پائی۔ بھٹو نے ان بڑے بڑے سیاسی جرائم کی پاداش میں یہ سزا نہیں پائی، بلکہ ایک شخصیت کے قتل میں تختۂ دار پر پہنچے۔ یہ ایسی صورت حال تھی جس میں سیاست کا شائبہ تک نہیں تھا اور اس میں وہ شان و شکوہ تھی جو سیاست اور سیاسی مقتولوں کا خاصہ ہوتی ہے جس میں سزا پانے والا موت بھی پاتے، تو اس میں بھی ایک شان ہوتی ہے — یہ سب کچھ اللہ ہی کی پکڑ تھی جس کی رسی دراز ہوتی ہے لیکن اُس کی گرفت سخت ہوتی ہے، نومبر ۱۹۷۴ء کی اُس رات جب اپنی پارٹی سے اُبھرنے والے سیاسی مخالف صاحبزادہ احمد رضا قصوری کے بجائے اُن کے والد نواب محمد احمد خان کو قتل کیا گیا تو نہ بھٹو نہ اُن کے مخالف یہ اندازہ لگا سکتے تھے کہ اللہ کی پکڑ کا آغاز ہو چکا ہے اور پھر یہ اللہ کی پکڑ ہی تھی کہ بھٹو کا ذہن اپنے دورِ اقتدار میں اس مقدمے



کہ جو اُس کے خلاف قانونی طور پر وہی واحد مقدمہ تھا، ختم کرنے کا انتظام کر دیتا۔ بالخصوص اس دوران جب کہ مُدعی احمد رضا قصوری اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک بار پھر پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے تھے اور اُن دنوں تو..... لیکن یہ بات اُس کے ذہن میں نہ آسکی۔

مسٹر بھٹو جب دسمبر کے اواخر میں سُپریم کورٹ کے سامنے ہائی کورٹ کے فیصلے پر اپیل میں پیش ہوئے، تو اُنہیں اس صُورتِ حال کا احساس تھا کہ وہ ایک ایسے مقدمے میں ہیں جس میں اگر اپنی سزا کم بھی کرالیں تو اُنہیں کوئی سیاسی فائدہ نہیں ہو گا۔ وہاں وہ کہہ رہے تھے کہ میری دُشمنیاں اس سے کہیں بڑی ہیں۔ مُلک کے باہر بھی اور مُلک کے اندر بھی۔ تعجب ہے مجھے احمد رضا کے والد کے قتل میں سزا دی جا رہی ہے!! ـــــ اُن کا مرتبہ کسی بُلند اور اعلیٰ سیاسی کیس کا متقاضی تھا، اُن کے سیاسی مخالف بھی انہی سیاسی جرائم پر اُن کو سزایاب دیکھنا چاہتے تھے، لیکن خدا کا اپنا منصُوبہ تھا۔ وہ یہ حساب کسی اور طرح چکانا چاہتا تھا۔ اس طرح کہ سب عبرت عبرت پکار اُٹھیں اور وہ جو اس شخص کے حُکم سے قتل ہوئے، ڈاکٹر نذیر، خواجہ رفیق، مولوی شمس الدین، عبدالصمد اچکزئی، اسداللہ مینگل اوُر اور شاید حیات شیرپاؤ بھی ـــــ! اور وہ سندھ کے ہُر بھی جنہیں گردہ در گردہ ہاتھ پاؤں باندھ باندھ کر گولیوں سے اُڑا دیا گیا اور جن کی لاشیں نامعلوم ویرانوں میں پھینک دی گئیں، وہ جن کی قبروں کے نشان بھی نہیں رہنے دیئے گئے

اور وہ ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰؐ کے ہزار سے زائد شہداء جنہیں بیدریغ مار ڈالنے کا حُکم تھا اور اب جب وہ اپنے کیے کی سزا پا رہا تھا تو دُنیا بھر سے رحم کی اپیلوں کے باوجود اس پر رحم نہیں کھایا جا سکا، جو خلق خدا پر رحم کھانا نہیں جانتا تھا، جس کی رعُونت سے اُس کے ساتھی بھی پناہ مانگتے تھے اور جو خدا بن کر لوگوں کو، اپنے جیسے جیتے جاگتے انسانوں کی زندگیوں کے خاتمے کا حُکم دیا کرتا تھا۔



ایک جلسے کے بعد لاشوں کی شناخت کا مرحلہ



۱۵ اکتوبر ۱۹۷۵ء ـــ یہ لڑکا جلسہ سُننے آیا تھا

یہ کون بول رہا تھا خدا کے لہجے میں
یہ وقت کس کی رعُونت پہ خاک ڈال گیا

بھٹو نے اپنی زندگی میں کئی بار قتلِ عام کرایا۔ طالب علموں، وکلاء، علماء، مزدوروں، عورتوں اور عوام کے مجمعوں پر بارہا فائرنگ کرائی، لیکن چار ایسے بڑے قتلِ عام ہیں کہ تاریخ میں اُن کی داستان دُنیا بھر کی کسی سیاہی سے نہیں صرف خُون اور آنسوؤں ہی سے رقم کی جاسکتی ہے۔ یہ چار بڑے قتلِ عام:

- لیاقت باغ پنڈی کا قتلِ عام۔
- لاہور کے تاج پورہ گراؤنڈ میں قتلِ عام
- ۹ اپریل کو پنجاب اسمبلی کے گھیراؤ پر قتلِ عام
- پندرہ اپریل کا لاہور میں قتلِ عام

اتفاق کی بات ہے راقم الحرُوف ان چاروں بڑے قتلِ عام کا عینی شاہد ہے اور ان میں اتنے انسان مرتے ہوئے دیکھے ہیں کہ زندگی اور موت کے درمیان فرق کا احساس مٹ گیا تھا۔ اب بھی جب ان واقعات کی تصویریں ذہن کے پردے پر نمودار ہوتی ہیں، تو اسی کیفیت سے گزرنے لگتے ہیں۔

۲۳ مارچ ۱۹۷۳ء کو پنڈی میں ملک بھر کی فعال حزبِ اختلاف متحدہ جمہُوری محاذ کی صورت میں منظم ہونے کے بعد اپنا پہلا جلسۂ عام کر رہی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب بلوچستان میں بھٹو نے مینگل کی اکثریتی وزارت کو برطرف کر دیا تھا، اور سرحد سے مولانا مفتی محمود نے اس پر احتجاجاً وزارتِ اعلیٰ سے استعفیٰ دے کر ایک عظیم سیاسی روایت کی بناء ڈالی تھی۔ نیپ، مُسلم لیگ، جماعتِ اسلامی، جمہوری پارٹی، جمعیت العلمائے پاکستان اور جمعیت العلماء اسلام سب متحد ہو کر آمریت کا مقابلہ کرنے چلے تھے۔ پیر صاحب پگارا محاذ کے صدر تھے۔ ولی خان، میاں طفیل محمد، مفتی محمود، مولانا نورانی، پروفیسر غفور اور دُوسرے سب بڑے چھوٹے قومی رہنما ایک قومی پلیٹ فارم پر اکٹھے آ رہے تھے۔ عوام کی جمہُوری ولولہ انگیزیں متحدہ جمہُوری محاذ کے اعلانِ اسلام آباد کے بعد عروج پر تھیں، جہاں نیپ سمیت سب جماعتوں نے پاکستان کا منتہائے مقصود ـــ اسلام ـــ قرار دیا تھا ـــــ بھٹو کو یہ صورتِ حال قبول نہ تھی۔ اُس نے گورنر پنجاب مصطفےٰ کھر کے ساتھ مل کر عوام کے قتلِ عام کا منصُوبہ بنایا جسے "آپریشن شوگر کینڈی" (چینی کی ٹکیہ) کا نام دیا گیا۔ بھٹو صدرِ پاکستان، ایوانِ صدر سے براہِ راست اپنے عوام کے قتلِ عام کے اس آپریشن کی نگرانی کر رہا تھا۔ مصطفےٰ



۱۵ اپریل ۱۹۷۷ء — اس عمارت سے جلوس پر گولیاں برسیں

کر کر لیاقت باغ سے نسبتاً قریب پنجاب ہاؤس سے ہدایات جاری کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ اوپر فضا میں ہیلی کاپٹر اور جہاز صورتِ حال کا مجموعی جائزہ لینے کے لیے گردش کر رہے تھے۔ سب رہنما گولیوں کی بوچھاڑ میں سٹیج پر پہنچے اور چلتی گولیوں میں پُرجوش تقریریں کیں، اور جب لوگوں نے بھٹو کے فرستادہ قاتل غنڈوں کو مار بھگایا، تو باغ سے ملحق میونسپل کمیٹی کی لائبریری کی چھت پر متعین فیڈرل سیکورٹی فورس نے لاکھوں (کم از کم دو لاکھ) کے اس مجمع پر گولیاں برسانا شروع کیں اور چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔ سٹیج کو گولیوں اور آتش گیر مادے سے بھسم کیا گیا — عوام نے جاں نثاری سے قومی رہنماؤں کے گرد جسموں کی ڈھال بنا دی، انہیں بحفاظت باہر لے گئے۔ لیاقت باغ کے سرسبز چمن پر، دُور دُور تک سینکڑوں انسانی جسم بکھرے پڑے تھے۔ زخمی یا مُردہ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا — اور وہ اُدھر مری روڈ کی جانب ایک لاش باغ کے کنارے آہنی جنگلے پر جھولتی نظر آتی تھی۔ لیاقت باغ کے اردگرد ہر طرف آگ کے شعلے بلند تھے۔ یہ شعلے اُن گاڑیوں سے اُٹھ رہے تھے، جن پر پاکستان کے جی دار عوام اس اوّلین جلسے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ خون اور آگ کے اس منظر سے دل برداشتہ ہو کر میں شہادت گاہ لیاقت علی خان پر بنی ہوئی برباد شدہ سٹیج سے لیاقت میموریل ہال کی طرف چلتا ہوں۔ ہال کے پہلو میں مختصر سا چمن زار ہے، اور یہاں وہ منظر دیکھتا ہوں جسے کبھی بھلا نہیں سکا۔ جنگلی گلاب کی ایک بڑی جھاڑی پر ایک نوجوان کی لاش نیم ایستادہ پڑی ہے، نوجوان اپنے پاؤں پر کھڑا ہے۔ اس کا جسم پیچھے کی طرف جھکا ہوا ہے، دایاں ہاتھ پوری لمبائی میں سر سے اُوپر کھلا ہے، مٹھی بھینچی ہوئی ہے، ہونٹ وا ہیں، یُوں لگتا ہے، جیسے جوش میں نعرہ بلند کرتے کرتے یہ نوجوان کمر کے بل جھاڑی پر آگرا ہے۔ اُس کی زندگی کا یہ آخری لمحہ ساکت ہو گیا ہے یہ لمحہ امر ہو گیا ہے، اُسے دوام حاصل ہے۔ یُوں لگتا ہے وُہ نوجوان ابھی ابھی آگے لپکے گا، اور نعرہ اُس کے ہونٹوں سے اُبل پڑے گا — اُسے گولی لگی تھی، ٹھیک دل پر — جس کے ساتھ ہی اُسے ہمیشہ کی زندگی مِل گئی — شہید کے خون سے جنگلی گلاب کی شہر میں پلی ہوئی جھاڑی رنگین ہو رہی تھی — اس شہید کے گرد ایک عجیب مہک برپا تھی۔ عجیب سی خوشبو کا گھیرا تھا یہ اواخر مارچ کی جواں بہار کی خوشبو نہیں تھی۔ یہ وہ خوشبو تھی۔ جو پہلے ایک بار دسمبر ۱۹۷۰ء کے موسم سرما کی اس سرد رات محسوس ہوئی تھی۔ جب پنڈی کے ایک گھر میں لنگرگڑھ کے محاذ سے ایک شہید کی لاش آئی تھی۔

بھٹو کے اس عہدِ ستم میں جب بھی بھٹو کے انجام پر شک گزرنے لگا، اس شہید کا چہرہ اور وہ خوشبو آ موجود ہوتی۔ پندرہ اکتوبر ۱۹۷۶ء کے تاچورہ گراؤنڈ میں اس خوشبو کی لہر اُٹھی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے یہ دُوسرا بڑا قتلِ عام اپنے اُس ساتھی کو شکست دینے کے لیے برپا کیا تھا جو پہلے قتلِ عام میں اُس کا دستِ راست تھا۔ اب قاتلِ عوام زیادہ تجربہ کار ہو چکا تھا پہلی فائرنگ کے پانچ سات منٹ کے بعد لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے ہاتھ ریڑھیاں آگئیں زخمی، زندہ، مردہ، بے ہوش، جو گرے پڑے تھے، انہیں شکار کیے گئے پرندوں کی طرح اُوپر نیچے لاد کر لے جایا جا رہا تھا — فائرنگ کا آخری دور ختم ہونے کے بعد جب میں گنجان آبادی سے گھرے ہوئے اس میدان کی اردگرد کی گلیوں میں گھوم پھر رہا تھا۔ گھروں سے عورتوں کے بین کی آواز سے در و دیوار دہلتے محسوس ہوتے تھے — میرا ویر! میرا پُتر (میرا بھائی، میرا بیٹا) یہاں بیسیوں ویر، بیسیوں پُتر گم تھے — اور جن کے ویروں، پُتروں کی لاشیں گولیوں کی برسات میں نکال لائی گئی تھیں، اُس رات اُنہیں آواز نکالنے کی اجازت نہیں تھی۔ شاد باغ کے ایک مکان میں سات بہنوں کے اکلوتے بھائی اور چار بیٹیوں کے باپ کی لاش پڑی ہے — بہنیں، بیٹیاں دیواروں سے سر مارتی، لاش کے پلنگ کے ساتھ چمٹتی ہیں کہ اپنی آواز پر قابو پائیں، اور کبھی ساکت خاموش کھڑی ہو جاتی ہیں — مکان کے باہر پولیس کھڑی ہے، قاتل کی حکومت ہے، اور اُس کا حکم ہے کہ اگر مقتول کے اقربا کی رونے کی آواز سنائی دی گئی تو لاش چھین لی جائے گی — اندرون موری گیٹ ایسا واقعہ دیکھ آیا ہوں — بے آواز روتی ہوئی ان عورتوں، لڑکیوں کی نگاہیں جب آسمان کی طرف بلند ہوتی دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے قدموں تلے زمین کانپتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

اور یہ نو اپریل ۱۹۷۷ء ہے، میں گنگارام ہسپتال، فاطمہ جناح میڈیکل کالج ہسپتال کے INTENSIVE CARE WARD انتہائی خطرے میں زخمیوں کی وارڈ میں کھڑا ہوں، یہاں آٹھ نو زخمی زندگی کے آخری لمحوں سے گزر رہے ہیں۔ میرے سامنے ایک بار پھر بے آواز رونے کا منظر ہے۔ ایک اٹھارہ انیس برس کا نوجوان زخمی، بے ہوش پڑا ہے۔ اُسے منہ کے اندر تالو میں گولی لگی ہے۔ اُس کے بچنے کا کوئی امکان نہیں۔ پاس اُس کی بڑی بہن بیٹھی ہے جو رو رہی ہے، لیکن آواز نہیں، خاموشی سے آنسو بہائے جا رہی ہے — یہ بے آواز رونا ہے، لیکن آج اس رونے میں

تجزیہ

ہارون الرشید

بھٹو کے بعد

پیپلز پارٹی کا کیا بنے گا؟

کہ موت کی طرف دھکیلنے والوں میں ایک ایسا گروہ بھی شامل ہے جس پر اب مسٹر بھٹو تک کسی کی نظر نہیں پڑی۔ وہ گروہ جس نے مسٹر بھٹو کو بے بس کر کے رکھ دیا اور وہ آنکھیں بند کر کے موت کے راستے پر آگے بڑھتے گئے۔ اس پُراسرار گروہ کی ابھی تک نشان دہی نہیں کی گئی نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ بظاہر بھٹو کا حامی یہ گروہ کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ ایک ناقابلِ تردید ذریعے کی اطلاع ہے کہ ۳ اپریل کی دوپہر کو جب مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ بیگم نصرت بھٹو اور آنسہ بے نظیر بھٹو کی تین گھنٹے کی ملاقات اختتام کو پہنچی تو مسز بھٹو سپرنٹنڈنٹ جیل کے پاس پہنچیں اور انہوں نے چیختے ہوئے کہا "مجھے صدر ضیاء الحق کے پاس لے چلو، میں فوراً ان سے ملنا چاہتی ہوں" جیل حکام نے فوراً ٹیلی فون پر اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کیا۔ جواب ملا کہ صدر اس وقت اُن سے نہیں مل سکتے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں لکھ کر دے دیں۔ معتبر ذرائع کے مطابق یہ جواب خود اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کرنے کے بعد انہیں دیا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو نے کاغذ طلب کیا اور انگریزی میں ایک مختصر سی تحریر لکھی۔ یہ تحریر خاکی رنگ کے ایک لفافے میں سیل بند کر کے صدر کے پاس بھیج دی گئی۔ اس خط میں بیگم بھٹو نے کیا لکھا تھا اس بارے میں قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے کہ اصل بات تو غالباً اُن کے اور صدر ضیاء الحق کے سوا کوئی نہیں جانتا مگر یہ بات تو واضح ہے کہ اس تحریر میں انہوں نے صدر سے ملنے کی درخواست کی ہوگی جس کا وہ زبانی طور پر اظہار کر چکی تھیں۔ اندازہ یہ ہے کہ مسٹر بھٹو کی بیوی نے جنہیں اپنے شوہر کی اقتدار سے علیحدگی کے بعد ان کے قابلِ اعتماد سیاسی مشیر اور نمائندے کی حیثیت حاصل رہی ہے اور جو اب اُن کی جانشین ہیں، آخر کار کسی سودے بازی کی کوشش کی، مگر یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ اس معتبر ذریعے کے مطابق اس آخری ملاقات کے دوران مسٹر بھٹو تو برابر یہ تاثر دیتے رہے کہ انہیں پھانسی پر نہیں لٹکایا جا سکتا اور حکام دراصل انہیں خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر بیگم بھٹو اس وقت اپنے سابقہ اندازوں کے برعکس یہ محسوس کر چکی تھیں کہ صورتحال وُہ نہیں ہے جیسی کہ انہیں بتائی جاتی رہی ہے۔

اس ذریعے نے یہ بھی بتایا ہے کہ مسٹر بھٹو نے پھانسی کے تختے کی طرف جاتے ہوئے عبدالحفیظ پیرزادہ اور یحییٰ بختیار کے رویے پر رنج کا اظہار کیا اور کہا کہ انہیں اندھیرے میں رکھا گیا۔ اپنے ان نائبین کے بارے میں مسٹر بھٹو کے اس تاثر کی تائید اُن کے آخری الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ "مجھے اپنی بیوی پر ترس آتا ہے، وُہ بے چاری اکیلی رہ گئی ہے"۔

یہ ایک الگ سوال ہے کہ مسٹر حفیظ پیرزادہ اور یحییٰ بختیار بھٹو کو اندھیرے میں رکھ کر کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر باخبر ذریعے جو کچھ بتاتے ہیں، اُس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف مسٹر بھٹو کو یہ تاثر دیتے رہے کہ انہیں موت کی سزا نہیں دی جا سکے گی بلکہ وہ بیگم بھٹو اور مس بے نظیر بھٹو کو بھی یہی بتاتے رہے، چنانچہ وہ ماں بیٹی پر زور دیتے رہے کہ انہیں رحم کی اپیل نہیں کرنی چاہیئے اس کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ یہ بات تو اپریل کے پہلے دو دنوں میں پوری طرح واضح ہو گئی تھی کہ صدر ضیاء الحق صرف رحم کی اُس اپیل پر غور کر سکتے ہیں جو مسٹر بھٹو کی طرف سے کی گئی ہو۔ اقبالِ جرم کے ساتھ؟ اربابِ حکومت کے باخبر سیاسی اور سفارتی حلقے واضح طور پر اس رائے کا اظہار کر رہے تھے، چنانچہ "بادبان" کے اُس شمارے میں جناب مختار حسن نے کسی ابہام کے بغیر لکھا کہ بھٹو اب بھی اپنی زندگی بچا سکتے ہیں مگر اس کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ خود رحم کی درخواست کریں۔ اگر وہ ایسا کر دیں تو جنرل ضیاء الحق کو اس پر غور کرنا ہی پڑے گا۔ درحقیقت بیگم نصرت بھٹو یا مس بے نظیر بھٹو کی طرف سے کسی اپیل کے بھی یہی معنی ہوتے مگر اُن کی طرف سے کوئی اپیل نہ کی گئی اور جب مسز نصرت بھٹو ایسا کرنے پر آمادہ ہوئیں تو وقت گزر چکا تھا۔ اپیل کرنے کی آخری تاریخ گزر چکی تھی اور صدر ضیاء الحق ان اپیلوں کو یکسُو ہو کر مسترد کر چکے تھے۔ کسی بھی قوتِ فیصلہ رکھنے والے حکمران کی طرح جسے نازک وقت کا سامنا ہو وہ ایک دوٹوک مؤقف اختیار کر چکے تھے اور اب بیگم بھٹو سے گفتگو کا آغاز کر کے وہ مذاکرات اور قیاس آرائیوں کا دروازہ کھولنے پر آمادہ نہیں تھے۔ انہیں ایک بھی ایسی اپیل موصول نہ ہوئی تھی جو قواعد پر پُوری اترتی ہو جس میں جرم کا اعتراف شامل ہو۔ ان میں عبدالحفیظ پیرزادہ کی وہ اپیل شامل تھی جس میں رحم کا لفظ استعمال کرنے سے گریز کیا گیا تھا اور سارا زورِ بیان مسٹر بھٹو کی خدمات گنوانے پر صرف کر دیا گیا تھا۔ کیا پیرزادہ جو خود ایک قانون دان ہیں اور جن کی ذہانت سے انکار نہیں ہو سکتا، رحم کی اپیل کے فنی تقاضوں سے آگاہ نہیں تھے؟

بے بسی اور فریاد نہیں ___ عزم ہے ناقابلِ شکست ہونے کا عزم، شکست دینے کا عزم۔

نو اپریل اسی عزم کی داستان ہے جب لاہور اور پنجاب بھر سے اُمڈتے ہوئے عوام کے سیلاب نے ہائی کورٹ سے پنجاب اسمبلی تک لاشیں بچھا کر قاتل آمر کی حکومت اور حکم کے پرخچے اُڑا دیے تھے۔ مارچ ۱۹۷۷ء کے جعلی انتخابات کے ذریعے لائی گئی صوبہ پنجاب کی اسمبلی کا افتتاحی اجلاس تھا۔ قاتل وزیرِ اعظم بذاتِ خود لاہور میں موجود تھا اور اسمبلی کے اجلاس کے انعقاد کو کامیاب بنانا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا اگر اُس نے پنجاب اسمبلی کا اجلاس پُرامن طور پر منعقد کرا لیا، تو ملک بھر کے عوام کے حوصلے پست ہو جائیں گے۔ یہ وہ دن تھا جب لاہور کی شاہراہ قائدِ اعظم پر ہونے والے اس قتلِ عام کی شدت کا یہ عالم تھا کہ عدالتِ عالیہ کی عمارت تک میں جا کر لوگوں کو گولیاں ماری گئیں۔ یہ قتلِ عام کے آقا بھٹو کا حکم تھا کہ کسی قیمت پر عوام کو ہائی کورٹ سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے، لیکن عوام گولیوں کی دیواریں اپنے جسموں سے ڈھاتے ہوئے اسمبلی کے سامنے جا پہنچے۔ ان پہنچنے والوں میں ہزاروں کی تعداد میں خواتین بھی موجود تھیں، مرکزی وزارتِ داخلہ کے ایک بڑے عہدے سے خصوصی طور پر پنجاب کو قابو کرنے کے لیے انسپکٹر جنرل پولیس بنا کر بھیجے گئے" فضل حق نے تھانہ سول لائن میں اپنا آپریشنل ہیڈ کوارٹر بنا کر رکھا تھا، جن کا گورنر ہاؤس میں مقیم بھٹو سے براہِ راست رابطہ تھا۔ بھٹو براہِ راست اس آپریشن میں ہدایات دے رہے تھے، اور اس دوران بارہ بجے دوپہر سے ذرا بعد ایک ایسا موقع بھی آیا، جب ہر قسم کا گولہ بارود اور آنسو گیس کے شیل ختم ہو چکے تھے، اُس وزیرِ اعظم کے براہِ راست حکم پر مزید سپلائی آنے تک گورنر ہاؤس کے قریب ریزرو رکھے گئے، رینجرز کے دستوں کو آگے بڑھایا گیا، ورنہ عوام کا ہجوم اسمبلی پر چڑھ دوڑتا، نو اپریل کے قتلِ عام نے بھٹو کے اقتدار کے خاتمے کو عیاں کر دیا تھا، لیکن جواری نے آخری داؤ کھیلا۔

یہ آخری داؤ بھی پندرہ اپریل کو ناکارہ ثابت ہوا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا خیال تھا، کہ وہ اپنے کارکنوں اور ساتھ لگے ہوئے غنڈہ عناصر کو مسلح کر کے اُن کے ذریعے قومی اتحاد کی تحریک کچل سکتا ہے۔ پندرہ اپریل کو لاہور کے میکلوڈ روڈ پر پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور غنڈوں نے قتلِ عام سے اپنی دہشت اور دھاک بٹھانا چاہی، لیکن یہ آخری تجربہ بھی ناکام ہوا، قومی اتحاد کے جلوس پر رتن

اس طرح جو صورت حال سامنے آتی ہے، اس سے یقینی طور پر ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ صدر ضیاء الحق اگر رحم کی اپیل منظور کرنے اور مجرم کی جاں بخشی کرنے کی کوئی صورت تلاش کرنا بھی چاہتے تو نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے ہاتھ باندھ دیے گئے تھے۔ کیا وہ اس صورت میں مسٹر بھٹو کی موت کا فیصلہ واپس لینے کا حکم دے دیتے جب کہ ان کے بے گناہ ہونے پر اصرار کیا جا رہا تھا؟ — کیا اس کا مطلب یہ نہ ہوتا کہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ نے جو فیصلے دیے ہیں وہ درست نہیں ہیں۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے مخالف بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ بے مثال ذہانت رکھنے والے شخص تھے۔ بہت ہی کم مواقع پر سیاسی میدان میں اُن کے اندازے غلط ثابت ہوتے اور ان میں یہ آخری موقع بھی شامل تھا۔ وہ سمجھتے رہے کہ غیر ملکی حکومتوں کا دباؤ صدر ضیاء الحق کو پھانسی کی سزا پر عمل درآمد کرنے سے باز رکھ سکتا ہے۔ وہ یہ اندازہ لگانے میں ناکام ہو گئے کہ اقبالِ جرم کے بغیر انہیں معاف کر کے جنرل ضیاء الحق ملک کو فساد کے حوالے کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔

یہ بات یقینی ہے کہ مسٹر بھٹو کو پھانسی کے پھندے سے بچانے کا جو واحد راستہ باقی رہ گیا تھا اُسے اُن کے نائبین عبدالحفیظ پیرزادہ، یحییٰ بختیار اور دوسروں نے بند کر دیا۔ اب صرف ایک ہی سوال باقی رہ جاتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کر رہے تھے۔ کیا پیپلز پارٹی نے فوج سے محاذ آرائی کا جو راستہ اختیار کیا تھا، وہ اس پر ایسے غیظ و غضب کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے، جس نے اُن کی آنکھیں بند کر دی تھیں؟ بہت سے لوگ اس دلیل سے اتفاق نہیں کریں گے، بالخصوص جب کہ سوال اس شخص کی زندگی کا ہو جس کے گرد پیپلز پارٹی کی ساری سیاست اور شاید قوت بھی گھوم رہی تھی۔ سوال یہ ہے کہ ان کی پارٹی نے مسٹر بھٹو کی موت سے کیا حاصل کیا ہے۔ دوسروں کی بات چھوڑیئے، خود اس جماعت کے لیے تو ان کی زندگی ہی سودمند تھی۔

میں نے یہ سوال پیپلز پارٹی کے ایک ذمّہ دار لیڈر کے سامنے رکھا۔ وہ اس موضوع پر بات کرنے سے خوف زدہ تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر ان کے حوالے سے یہ موضوع زیرِ بحث آیا تو مسٹر بھٹو کے مذکورہ نائبین اُن کا نام غداروں کی فہرست میں شامل کر دیں گے۔ میں نے بمشکل انہیں اس بات کا یقین دلایا کہ ان کا حوالہ نہیں دیا جائے گا، تو انہوں نے رنجیدہ لہجے میں کہا: بھٹو صاحب کے ان سیاسی مخالفین کے علاوہ، جن سے وہ گزشتہ دو برس سے برسرِ پیکار تھے، ایک اور عنصر بھی ایسا ہے جو ان کے گلے میں پھانسی کا پھندہ دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ یہ کمونسٹ تھے جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بھٹو کی لاش کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں گے۔ اُنہوں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ یحییٰ بختیار اور حفیظ پیرزادہ دانستہ یا نادانستہ طور پر کمونسٹوں کے آلۂ کار بن گئے جو پارٹی میں پہلے سے کہیں زیادہ مؤثر ہیں۔ ہو سکتا ہے انہیں اس خوف نے گھیر لیا ہو کہ اگر انہوں نے لچک کا مظاہرہ کیا تو پارٹی کے حامی اخبارات اُن کی کردار کشی پر اتر آئیں، جن پر کمونسٹ بُری طرح چھائے ہوئے ہیں۔ بعض سیاسی حقائق وقت گزرنے کے ساتھ ہی واضح ہوتے ہیں اور شاید یہ معاملہ بھی ایسا ہے — مگر ایک بات تو واضح ہے کہ بھٹو کی موت کے بعد ہنگامے برپا کرنے کی جو کوششیں کی گئیں اُن میں کمونسٹ ہی پیش پیش تھے ورنہ پارٹی کی قیادت تو یہ سمجھتی ہے کہ اس وقت قوت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مسٹر بھٹو کے اس دُنیا سے رُخصت ہوتے ہی پیپلز پارٹی کی قیادت کے خلاف کمونسٹ حلقوں نے اپنے پروپیگنڈے کا آغاز کر دیا ہے۔ پارٹی کے وُہی لیڈر جن کی تعریف میں وہ زمین آسمان کے قلابے ملاتے رہے، جن کی بڑی بڑی تصویریں اور انٹرویو شائع کرتے رہے، اب انہیں وڈیرے اور چودھری نظر آنے لگے ہیں۔ حالانکہ پیپلز پارٹی میں ہمیشہ سے ہی وڈیرے اور چودھری مؤثر رہے ہیں۔ کراچی سے چھپنے والے پارٹی کے حامی ایک پرچے نے بھٹو کا ایک پیغام شائع کیا، جو اُس کے بقول بھٹو نے پھانسی پا جانے سے تین چار روز قبل سنٹرل ایگزیکٹو کے ارکان کو بھیجا اور جس میں کہا گیا تھا کہ وہ سڑکوں پر نکل آئیں۔ مضمون نگار نے بڑی ہوشیاری سے یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ان لیڈروں نے بزدلی کا رویہ اختیار کیا۔ وہ یہ بات بھول گیا کہ ملک میں تحریک کے آثار سرے سے موجود ہی نہ تھے اور اگر یہ لیڈر سپریم کورٹ کے فیصلے پر احتجاج کا غیر قانونی راستہ اختیار کرتے ہوئے باہر نکل بھی آتے تو لوگ اُن کا ساتھ نہ دیتے اور وہ توہینِ عدالت کے جرم میں عدالتوں کا سامنا کرنے کے سوا کچھ حاصل نہ کر سکتے۔ پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کے ذمّہ دار ارکان اس اطلاع کی تردید کرتے ہیں اور اُن کا کہنا ہے کہ اس طرح کا کوئی پیغام سنٹرل ایگزیکٹو کو بھیجا ہی نہیں گیا۔

اس وقت جب کہ پیپلز پارٹی کی قیادت اپنی قوت کو بچا کر رکھنا چاہتی ہے اور ہنگاموں سے لاتعلقی کا اعلان کر رہی ہے، یہ گروہ ہنگاموں کو ہوا دینے پر تُلا ہوا ہے۔ وہ یقینی طور پر پیپلز پارٹی کی موجودہ قیادت کی کردار کشی کر کے اُسے غیر مؤثر بنانا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ بیگم بھٹو اور بے نظیر بھٹو کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرے۔ وہ جانتا ہے کہ مسٹر بھٹو کے برعکس جو ہمیشہ کمونسٹوں کو اپنے اقتدار کے لیے استعمال کرتے رہے، مسز بھٹو اور بے نظیر اتنی سیاسی سُوجھ بُوجھ نہیں رکھتیں کہ انہیں استعمال کر سکیں، بالخصوص جب کہ پارٹی کے حامی ذرائع ابلاغ پر ان کے قبضے کا عمل مکمل ہو چکا ہے۔

پاکستان کا کمونسٹ عنصر اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس کے لیے قوت حاصل کرنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ وہ آگے بڑھ کر پیپلز پارٹی پر قبضہ کرے۔ کیا یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ وہ کس کے اشارے پر ایسا کر رہا ہے۔ سرحد پار سے کون سی آواز اس کی رہنمائی کر رہی ہے؟

●●

سینما سے فائرنگ کی گئی، رتن سینما کو عوام نے جلا کر راکھ کر دیا۔ رتن سینما سے ذرا آگے سٹیشن کی طرف لاہور ہوٹل کے چوک میں عبدالکریم بلڈنگ موجود ہے، جسے زرد رنگ کی وجہ سے پیلی بلڈنگ کہا جاتا ہے۔ پیلی بلڈنگ کی چھت اور بالکونیوں سے عوام پر ہزاروں راؤنڈ فائر کیے گئے، عجیب جذبہ تھا، لوگوں کے پرے کے پرے قطار اندر قطار آگے بڑھتے جو زخمی ہو جاتا، اُسے فوری طور پر موٹر سائیکل سوار اور پچھلی سواری کے درمیان بٹھا کر بے ہوشی کے عالم ہی میں ہسپتال لے جاتے — گولیوں کی اس بارش میں ایک نوجوان نے بلڈنگ کے نیچے ڈرائی کلینرز کی دکان کے سامنے آگ بھڑکا دی، جب بلڈنگ میں فائرنگ کے لیے متعین افراد کی توجہ آگ کی طرف ہوئی، تو ایک جی دار جیالا نوجوان بلڈنگ کی بالائی منزلوں پر جا پہنچا اور دست بدست جنگ میں آگ چاٹتی ہوئی اس عمارت میں کئی افراد ہلاک ہوئے — یہ قتلِ عام کا حکم دینے والے بھٹو پر عوام کی آخری فتح تھی، جس کے بعد پانچ جولائی ،، تک ذوالفقار علی بھٹو کو قدم بہ قدم شکست ہوتی چلی گئی۔

بھٹو اقتدار سے محروم ہونے اور ڈیڑھ برس سے زائد ایک قتل کے مقدمے میں اپنی صفائی پیش کرنے کے بعد ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے حکم سے سزائے موت کے مستحق ہوئے۔ اور اُسی شہر میں، اُسی ایوانِ حکومت سے چند گز کے فاصلے پر پھانسی پائی، جہاں انہوں نے خوفِ خدا، روزِ حشر اور قانونِ مکافات سے بے پروا قتل کے احکامات صادر کیے تھے — یہ وہ ایوان تھا جسے حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ملک توڑا، قائدِ اعظمؒ کا پاکستان دو ٹکڑے کیا، مجیب سے مل کر سازش کی اور جو آدھا ملک انہیں ملا اس میں انہوں نے دلائی کیمپ، شاہی قلعہ اور وارسک میں ٹارچر ہاؤس بنائے۔ مجیب کا حشر بھٹو کے سامنے ہوا، لیکن انہوں نے کوئی عبرت حاصل نہ کی، بلکہ خود اُسی عبرت کا حصہ بنا — پاکستان کو ڈھانے والے دونوں ایک ہی انجام، غیر قدرتی موت سے دوچار ہوئے۔ جناب محمد احمد خان کی بیوہ نے سلیم احمد کے اشعار کی صورت میں مسٹر بھٹو کے عبرت ناک انجام پر جو تبصرہ کیا ہے، وہ سیر حاصل ہے۔

یہ لمحۂ موجود ہی وہ روزِ جزا ہے
جس کا تجھے اس درجہ یقیں تھا کہ نہیں ہے
تو منکرِ قانونِ مکافاتِ عمل تھا
لے دیکھ ترا عرصۂ محشر یہیں ہے

●●

سکندر حمید لودھی



ملک قاسم سے لے کر چودھری ظہور الٰہی تک سبھی کوشش کرتے رہے کہ استعفیٰ کی وجوہات معلوم کر سکیں، مگر چٹھہ صاحب آمادہ نہ ہوئے —— وہ ہر سوال کے جواب میں یہی کہتے —— "نہیں بھائی جی تہانوں نئیں پتہ"

محمد حسین چٹھہ نے استعفیٰ کیوں دیا؟

پاکستان مسلم لیگ کے ایک گروپ کے سربراہ چودھری محمد حسین چٹھہ نے بالآخر صدارتی ذمہ داریوں سے سبکدوشی کا اعلان کر دیا۔ معتمر رہنما نے آئین کے تحت اپنے سے زیادہ معتمر نائب صدر خواجہ خیر الدین کو قائم مقام صدر کے فرائض سونپ دیے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ ایک عام رکن کی حیثیت سے مسلم لیگ کو مضبوط بنانے کے لیے "کام کرتے رہیں گے۔ ان کے گروپ کے جنرل سیکرٹری ملک محمد قاسم نے جو پیر پگارا سے محاذ آرائی کا آغاز کرنے والے پہلے ممتاز فرد تھے، یہ اطلاع ۷ اپریل کے روز اچانک سُنی۔ انہوں نے اپنی تمام تر مصروفیات بالائے طاق رکھ کر فون نمبر ۳۳۷۰ اور فون نمبر ۳۳۵۱ پر رابطہ پیدا کیا۔ ۳۳۷۰ پر میاں عبداللطیف نے انہیں تفصیلات سے آگاہ کیا، مگر دوسرے فون پر چٹھہ صاحب نے انہیں ٹرخا دیا: "نہیں بھائی جی تہانوں نئیں پتہ" آنا فاناً ان کے جنرل سیکرٹری ملک محمد قاسم اور سیکرٹری اطلاعات اقبال احمد خان شیخوپورہ آ پہنچے۔ میاں عبداللطیف، چودھری سردار محمد ڈوگر، چودھری اشرف وڑائچ، ڈاکٹر اکرم حیدر، ملک قاسم اور اقبال احمد خان —— سبھی کی منت سماجت اور اصرار بے معنی نظر آتے تھے۔ وہ تو استعفے کی وجوہات بتانے پر بھی آمادہ نہیں تھے۔ "نئیں بھائی جی تہانوں نئیں پتہ"۔ ادھر مسلم لیگ کے استعفا واپس لینے کی تحاریک جاری تھیں اور اُدھر ——

—— فون نمبر ۳۳۷۰ پر برابر اسلام آباد سے کالیں موصول ہو رہی تھیں۔ چودھری ظہور الٰہی، خواجہ صفدر اور دوسرے ممتاز لوگ چٹھہ صاحب سے بات کرنے کے خواہش مند تھے۔ شاید آج کے دن چٹھہ کی زندگی میں سب سے زیادہ وی آئی پی ان سے رجوع کر رہے تھے۔ یہ سلسلہ ۸ اپریل کی شام کو دس بجے تک جاری رہا۔

جب میاں زاہد سرفراز نے بھی بیرونِ وطن سے واپسی پر میاں عبداللطیف سے جو چٹھہ صاحب کے معتمد خاص سمجھے جاتے ہیں، رابطہ پیدا کیا۔ تھک ہار کر ملک قاسم نے ۸ اپریل کی شام کو رات دس بجے کے بعد اے پی پی کو جو خبر فراہم کی، لُبِ لُباب یہ تھا: "مسلم لیگ کے صدر محمد حسین چٹھہ نے پارٹی دستور کی دفعہ ۵ ب کے تحت خواجہ خیر الدین کو صدارتی فرائض انجام دینے کا اختیار دیا ہے اور خواجہ صاحب قائم مقام صدر کی حیثیت سے کام کریں گے"!

ملک قاسم، اقبال احمد خان وغیرہ کی یہ رات شیخوپورہ میں انتہائی مصروف گزری۔ رات ڈھلے تک وہ روٹھ جانے والے صدر کو فیصلہ بدلنے پر مجبور کرتے رہے اور چٹھہ صاحب کی طرف سے انکار کا سلسلہ جاری رہا —— "نئیں بھائی جی، تہانوں نئیں پتہ"۔

* * *

۱۰ اپریل کو چٹھہ صاحب نے ڈیوس روڈ پر مسلم لیگ کے اپنے گروپ کے کونسلرز کے ایک اجلاس میں شرکت کی، تو وہ معمول کے مطابق ہشاش بشاش اور مستعد نظر نہیں آتے تھے، البتہ ان کی ذہنی رو کا اظہار ایک فقرہ میں ہوا: "میں صدر رہوں یا نہ رہوں، مسلم لیگ قائم رہے گی"۔ چٹھہ صاحب پچھلے دنوں سے اس بات پر زور دے رہے تھے کہ مسلم لیگ کے گروپوں کا اتحاد ہو جائے اور تمام کونسلرز (۱۹۷۵ء کی فہرستوں کے مطابق) مشترکہ اجلاس بلا کر نئے صدر وغیرہ کا چناؤ کریں۔ اب جب کہ انہوں نے اپنے عہدہ صدارت سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا ہے، تو ان میں سے کسی نکتے کا ذکر نہیں۔ استعفے سے پہلے کی ان کی کوئی ایسی سرگرمی بھی سامنے نہیں آئی جو پسِ پردہ حقائق کی وضاحت کر سکے —— ۸ اپریل کو صرف یہ معلوم ہو سکا کہ وہ نوائے وقت، پاکستان ٹائمز، آزاد بان، اور دوسرے اخبارات کے نمائندوں کو تلاش کر رہے ہیں کہ انہیں ایک اہم اعلان کرنا ہے۔ ان کے قریبی ساتھی بھی یقین کے ساتھ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں، البتہ مسلم لیگ کے بعض اہم اور عام اجلاسوں میں اُن کی تقاریر اور اخباری بیانات پر نظر دوڑائیں، تو خیال گزرتا ہے کہ وہ اپنے گروپ کے پندرہ فروری کے اجلاس کے بعد سے اپنے بعض خاص ساتھیوں سے خاصے نالاں نظر آتے تھے۔ اب وہ جناح باغ (لارنس باغ) میں سیر کے دوران گہری سوچ میں غرق نظر آتے تھے، اور ان کے چہرے پر تفکر کے آثار ہوتے۔ شاید وہ یہ سوچتے ہوں کہ —— انہوں نے مصالحت کی کوئی راہ نکال لی ہوتی، تو وہ ذہنی طور پر زیادہ مطمئن ہوتے!

چٹھہ صاحب نے چند ماہ قبل لاہور کے متنازعہ اجلاس میں اپنے گروپ کا عہدۂ صدارت قبول کرنے کے بعد مسلم لیگ کو فعال بنانے کی کوششیں کیں، مگر چودھریوں ہی کے سہارے۔ انہوں نے سندھ، بہاولپور ڈویژن اور دوسرے اہم علاقوں کے دورے بھی کیے۔ ملک قاسم، صاحبزادی محمودہ بیگم کے ساتھ اُن کے دیرینہ مراسم تھے، بناتی وزراء خواجہ محمد صفدر، میاں زاہد سرفراز اور ظہور الٰہی کا اعتماد انہیں حاصل تھا، پھر نجانے کس بنیاد پر انہوں نے بسے بسائے گھر سے باہر نکل آنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ چٹھہ صاحب نے مسلم لیگ میں ملک قاسم اور صاحبزادی محمودہ بیگم کی بعض کارروائیوں کے پیشِ نظر استعفیٰ دیا ہے —— کہا جاتا ہے کہ ۶ اپریل کے روز وہ صاحبزادی محمودہ بیگم کو مسلم لیگ کا نائب صدر بنائے جانے کی تجویز سے متفق نہ تھے۔ ایک دوسری قیاس آرائی یہ ہے کہ قومی اتحاد بنتے ہوئے سیاسی حالات کے پیشِ نظر اُن کے بجائے پگارا صاحب کے گروپ کو اہمیت دے رہا تھا اور یہ صورتِ حال وہ برداشت نہ کر سکے۔ ●●

مقبول عباس کاشر

قومی اتحاد نے اقتدار میں شامل ہو کر وقت کو اپنے ہاتھوں سے کھو دیا ہے، جبکہ تین دوسرے سیاستدانوں نے وقت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آخرکار وہ اکٹھے ہو جائیں گے اور ایک نیا سیاسی نقشہ تشکیل پائے گا۔

پگارا، اصغر خان اور نورانی کا اتحاد ہو جائے گا

میاں ممتاز دولتانہ سے خصوصی انٹرویو



میاں ممتاز دولتانہ سے میری ملاقات وہاڑی سے ۱۶ میل دور لڈن میں ہوئی۔ ان کے آبائی گاؤں میں۔ لندن سے "باعزت" واپسی کے بعد وہ یہاں مقیم ہیں۔ سیاست کے اعصابی مراکز سے دور، سیاست سے دور۔ عمر کے اعتبار سے انہیں بوڑھوں میں شمار کرنا چاہیے، مگر ان کے لہجے میں توانائی ہے اور چہرے پر تازگی۔ گفتگو میں وہی رونق، انداز میں وہی شگفتگی۔ پاکستان کی تاریخ کا یہ بہت کامیاب اور بہت ناکام سیاستدان، ان دنوں اپنے شب و روز مطالعے میں بسر کرتا ہے، جو سیاست کے علاوہ اس کا عمر بھر کا واحد ذوق ہے۔ دولتانہ کہتے ہیں کہ وہ سیاست کو طلاق دے چکے ہیں، لیکن کیا ایک ایسا شخص جس کی ساری عمر سیاست میں بیتی ہو، اس کے نشیب و فراز کو یوں الوداع کہہ سکتا ہے؟ یہ بات دل نہیں مانتا اور اس پہلو سے دیکھیں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ انتظار میں ہوں، اس لمحے کے انتظار میں جب انہیں ایک بار پھر کردار ادا کرنے کا موقع ہاتھ لگے۔ میں ملک کی الجھی ہوئی سیاسی صورت حال کے بارے میں اس شخص کے خیالات معلوم کرنے آیا تھا جس کی ذہانت کو بارہا اس کے مخالفوں نے بھی خراج تحسین پیش کیا ہے۔ وہ کسی باقاعدہ اخباری انٹرویو کے لیے تو آمادہ نہ تھے، مگر کچھ مختصر سی گفتگو رہی۔ سیاستدانوں اور سیاسی جماعتوں کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر اور سیاسی مستقبل کے بارے میں کچھ اندازے۔ میں نے پوچھا۔ مسلم لیگ کی موجودہ صورت حال کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔ آپ بہت پرانے مسلم لیگی ہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ ان میں سے کس مسلم لیگ کو اصل سمجھا جائے؟

انہوں نے کہا: میرے نزدیک تو چٹھہ گروپ اور پیر پگارا گروپ دونوں نقلی ہیں۔ قائد اعظمؒ کے بعد اور پھر مادرِ ملت کے بعد مسلم لیگ اپنے حقیقی وجود سے محروم ہو چکی۔ مجھے قائد اعظمؒ اور مادرِ ملت کا ہمسفر ہونے کا شرف حاصل ہے اور میں وہ چہرے خوب پہچانتا ہوں جو اس سفر میں شریک تھے۔ میں شخصیتوں پر تبصرہ کرنا نہیں چاہتا ہوں؛ البتہ مسلم لیگ کی صفوں میں مجھے ایک ایسا شخص ضرور نظر آتا ہے جو سچا مسلم لیگی ہے۔ خواجہ صفدر۔ میرا خیال ہے کہ انہیں "بچوں کی لڑائی" میں الجھنے کے بجائے آگے بڑھ کر صحیح صورتِ حال کی وضاحت کرنی چاہیے۔

سوال: ۱۹۴۵ء کے کونسلروں کی فہرست کا جو سوال اٹھا ہے، اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

میاں ممتاز دولتانہ: یہ تو ایک سٹنٹ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج جو لوگ مسلم لیگی بنے پھرتے ہیں، وہ ۱۹۴۵ء کی کسی فہرست میں بھی شامل نہیں ہو سکتے۔ بہت سے لوگ جو سچے مسلم لیگی تھے سیاست سے دست کش ہو چکے۔ ان کے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اسے دیکھ کر کڑھتے ہیں کہ جس عمارت کو انہوں نے خون دے کر تعمیر کیا تھا اس پر دوسرے قابض ہو چکے ہیں۔

مسلم لیگ کا صرف نام باقی ہے، وہ اپنے حقیقی مزاج اور کردار سے محروم ہو چکی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر آج بھی قائد اعظمؒ کے نظریات پر اعتقاد رکھنے اور مسلم لیگ سے محبت رکھنے والے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں تو وہ پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی قوت بن سکتے ہیں، مگر یہ سب کچھ ایک معجزے کی طرح ظہور پذیر نہیں ہو سکتا کہ اس کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں ہیں، مثلاً آپ دیکھتے ہیں کہ پیر پگارا سیاستدان نہیں، وہ مسلم لیگی بھی نہیں ہیں؛ اگرچہ مسلم لیگیوں کی ایک بڑی تعداد ان کے ساتھ ہے کہ وہ بہرحال پاکستان سے مخلص ہیں۔ تحریک پاکستان سے لیکر اب تک سندھ میں پاکستان کا نام سربلند رکھنے اور ملکی اتحاد کے لیے ان کی حر برادری کی خدمات ہیں۔

سوال: ایسی صورتِ حال میں آپ کس سیاسی مستقبل کی پیش گوئی کرتے ہیں؟

میاں ممتاز دولتانہ: میں مسلم لیگ کے بارے میں تو کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا؛ البتہ موجودہ سیاسی صورت حال پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اپنا یہ خیال بہت پختہ معلوم ہوتا ہے کہ آخرکار مولانا شاہ احمد نورانی، اصغر خان اور پیر پگارا

کا سیاسی اتحاد ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان قومی اتحاد نے اقتدار میں شامل ہو کر وقت کو اپنے ہاتھوں سے کھو دیا ہے، جبکہ ان تین سیاستدانوں نے وقت سے فائدہ اٹھایا ہے اور خوب کام کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سندھ میں نورانی اور پیر پگارا مضبوط سیاسی قوت ہیں۔ نورانی میاں پنجاب میں بھی قدم جما چکے ہیں، لہٰذا سندھ میں نورانی اور پگارا ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ اس طرح ان کے تعاون کا دائرہ آگے بڑھے گا تو پنجاب، سرحد اور بلوچستان میں بھی وہ ایک دوسرے سے قدم ملا کر چلیں گے۔ میں اصغر خان کی سیاسی پوزیشن پر اس وقت کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا؛ البتہ میری رائے یہ ہے کہ نورانی اور پیر پگارا سے اس کا اتحاد خود اس کے لیے اور ان دونوں کے لیے مفید نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ تینوں لیڈر ایک دوسرے کا مزاج سمجھتے ہیں۔ وہ یقیناً اکٹھے ہو سکتے ہیں اور کامیاب اتحاد تشکیل دے سکتے ہیں اور اس اتحاد کے نتیجے میں ایک نیا سیاسی نقشہ بن سکتا ہے۔

سوال: آپ کی رائے میں اس وقت الیکشن پاکستان کے لیے مفید ہیں؟

میاں ممتاز دولتانہ: پاکستان کے دو ہمسایہ ملکوں ایران اور افغانستان میں جو صورتِ حال پیدا ہو چکی ہے، اس سے تو یہی احساس پیدا ہوتا ہے کہ یہ انتخابات کا مناسب وقت نہیں ہے، کیونکہ انتخابی مہم کا فوری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ علیحدگی پسند اپنے بلوں سے باہر نکل آتے ہیں اور ایک عجیب دھما چوکڑی مچ جاتی ہے، لیکن ساتھ ہی ایک دوسرا سوال بھی ہے کہ اگر جمہوری عمل آگے نہ بڑھا تو اُلجھی ہوئی داخلی اور خارجی صورتِ حال سے کس طرح نمٹا جائے گا۔ تاہم ملک کے اندرونی حالات اور گرد و پیش کی صورتِ حال پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ذاتی طور پر میں یہی محسوس کرتا ہوں کہ یہ الیکشن کے لیے مناسب وقت نہیں ہے۔

سوال: کچھ "لندن پلان" کے بارے میں بتائیے جس کا ایک عرصہ سیاست میں تذکرہ رہا ہے۔

میاں ممتاز دولتانہ: بوگس بات! — ایک خواہ مخواہ کا تراشا ہوا افسانہ! میں اس وقت لندن میں تھا جب شیخ مجیب الرحمٰن کے حوالے سے لندن پلان کی بات چلی، اس وقت بھٹو بھی وہاں موجود تھا۔ میں چاہتا تھا کہ شیخ مجیب سے چند نکات پر گفتگو ہو اور اس کی وجہ میرا یہ احساس تھا کہ وہ پاکستان کو توڑنا نہیں چاہتا۔ ہمارے سیاستدانوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی سیاسی دکان چمکانے کے لیے غدار تخلیق کرنے لگتے ہیں — تو! میں چاہتا تھا کہ اس سے ملوں، مگر ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ یہی نہیں مجیب اور بھٹو کی بھی کوئی ملاقات نہ ہوئی — اور اچانک ہم نے دیکھا کہ "لندن پلان" کا شور اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ ایسا کوئی پلان موجود نہ تھا۔ میری ایک بات یاد رکھیے لندن میں جو پاکستانی رہتے ہیں وہ بہت محبِ وطن ہیں، ان سب سے زیادہ مُحبِ الوطنی کا شور مچاتے رہتے ہیں۔ وہ پاکستان کے خلاف ایک ادنیٰ سی بات برداشت نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ اتنا بڑا منصوبہ بن رہا ہو اور وہ خاموش رہیں۔ ●●

"بلوچستان کا مسئلہ" کے

پبلشر کے نام

جناب میاں عبدالرشید!

آپ کے ادارے کی شائع کردہ کتاب "بلوچستان کا مسئلہ" "بادبان" کے دفتر میں تبصرے کے لیے موصول ہوئی۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بادبان ماہ دسمبر ۱۹۷۸ء کے شمارے میں باقی طرح کا جو طویل "سوانحی انٹرویو" — شائع ہوا تھا، وہ کتاب میں لفظ بہ لفظ شامل کر لیا گیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ کے ادارے نے مجھ سے، کہ یہ طویل تحریر میرے ہی قلم سے لکھی گئی تھی، رابطہ قائم کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔ بعض دوسرے اداروں نے مجھ سے اس سلسلے میں بات کی تھی مگر میں نے اُنہیں منع کر دیا کہ میں خود اپنی منتخب تحریروں کا مجموعہ شائع کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔

میرے لیے سخت حیرت اور دکھ کی بات یہ ہے کہ آپ نے دانستہ اس موضوع پر مجھ سے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، بلکہ کتاب میں میرے نام کا حوالہ دینے سے یوں احتراز کیا گیا ہے جیسے ہندو عورتیں اپنے خاوند کا نام لینے سے ڈرتی ہیں۔ یہی نہیں "نوائے وقت" میں آپ کے فاضل تبصرہ نگار نے جہاں اس تحریر کو ادب کا ایسا شاہکار قرار دیا ہے، جسے نظر انداز کرنا اردو ادب کے ساتھ زیادتی ہوگی وہاں اس مضمون کو باقی طرح کی خود نوشت قرار دے دیا گیا ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ اگر سیاستدانوں کے بارے میں اخبار نویسوں اور ادیبوں کی تحریروں کا کریڈٹ ان شخصیتوں کو دینے کا رواج چل نکلا، تو کیا لکھنے والوں کی حیثیت وکیلوں کے "منشیوں" سے بھی بدتر نہیں ہوگی

معلوم نہیں یہ کس دانشور کی بصیرت کا معجزہ ہے کہ انٹرویو کو خود نوشت بنا دیا جائے۔ کیا اس کتاب کی طباعت کا اہتمام کرنے والوں میں ایک شخص بھی اتنی سوجھ بوجھ نہیں رکھتا جو یہ سمجھ سکتا کہ اس طرح کی طویل تحریریں کس محنت، جانفشانی اور عرق ریزی سے لکھی جاتی ہیں؟ اس بدقسمت معاشرے میں شاید تحریریں سب سے زیادہ بے مایہ اور بے وقعت چیز ہے — خوش نویس کو اس کا معاوضہ ادا کیا جاتا ہے، مہنگا کاغذ خریدا جاتا ہے، طباعت کے گراں قدر اخراجات برداشت کیے جاتے ہیں، اور اگر سرپرستی کرنے کے لیے کوئی اخبار موجود نہ ہو تو اشتہاروں کا معاوضہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے، لیکن لکھنے والا؟ وہ تو انٹرویو دینے والے کا منشی ہے نا؟ — اور اگر کسی بڑے اخبار کی سرپرستی حاصل ہو تو اس کا تمسخر بھی اڑایا جا سکتا ہے۔ اس کی تحریر شائع کرنے کے حقوق حاصل کرنے کی قانونی اور اخلاقی ذمہ داری پوری کرنا، تو ایک طرف، اس کا حوالہ دینے کی بھی ضرورت نہیں۔

آپ نے یہ کتاب ایسے وقت میں شائع کی ہے، جب میں اس انٹرویو سمیت دوسری تحریروں کی کتابت مکمل کرا چکا تھا — اور یقیناً ان میں جو تحریر سب سے اہم اور زیادہ قدر و قیمت رکھنے والی تھی، آپ نے "ادبی ڈاکہ زنی" کے لیے اسی کا انتخاب کیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس شرمناک واردات پر کن الفاظ میں احتجاج کروں۔ لکھنے والے کے لیے اس کی تحریر ہی سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہے، اور وہ جو خلوص اور محبت سے لکھتے ہیں، اپنے ہنر کو اولاد کی طرح عزیز رکھتے ہیں — اب اگر کوئی اسی پر ڈاکہ ڈالنے پر تل جائے، تو اس سے کیا کہا جائے۔

میں اپنے وکیل کے ذریعے آپ کو الگ سے نوٹس بھجوا رہا ہوں، اگرچہ میں نہیں جانتا کہ قانونی کارروائی کا پیچیدہ عمل کتنا وقت لے گا اور کیا قانونی ضابطے اس ظلم کا تدارک کرنے کی اہمیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں — خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ آپ کے سرپرست بڑے ہی طاقتور ہیں اور مجھے مشورہ دیا گیا ہے کہ میرے لیے اس ظلم پر خاموش ہو رہنا ہی بہتر ہوگا۔ تاہم میں اس امید پر آپ کو لکھ رہا ہوں کہ اگر طباعتی تیر کرداروں میں کوئی ایک بھی صاحبِ کردار موجود ہے جو اس زیادتی کو محسوس کر سکتا ہے، تو آپ تلافی کی کوئی صورت تلاش کرنے کے لیے مجھ سے بات کریں۔

والسلام

ہارون الرشید

ہفت روزہ "بادبان" لاہور

دس اپریل ۱۹۷۹ء

خاص "بادبان" کے لیے

غزل

اکڑ اکڑ کے نہ چل اس زمیں پہ کھال میں رہ
ترا حساب نہ ہوگا نہ اس خیال میں رہ

جو بچ رہا ہے اُسے ہاتھ سے نہ جانے دے
یہی کمال ہے تیرا اسی کمال میں رہ

اسی میں خیر ہے پیارے ترے نشیمن کی
نہ اشتعال میں رکھ اور نہ اشتعال میں رہ

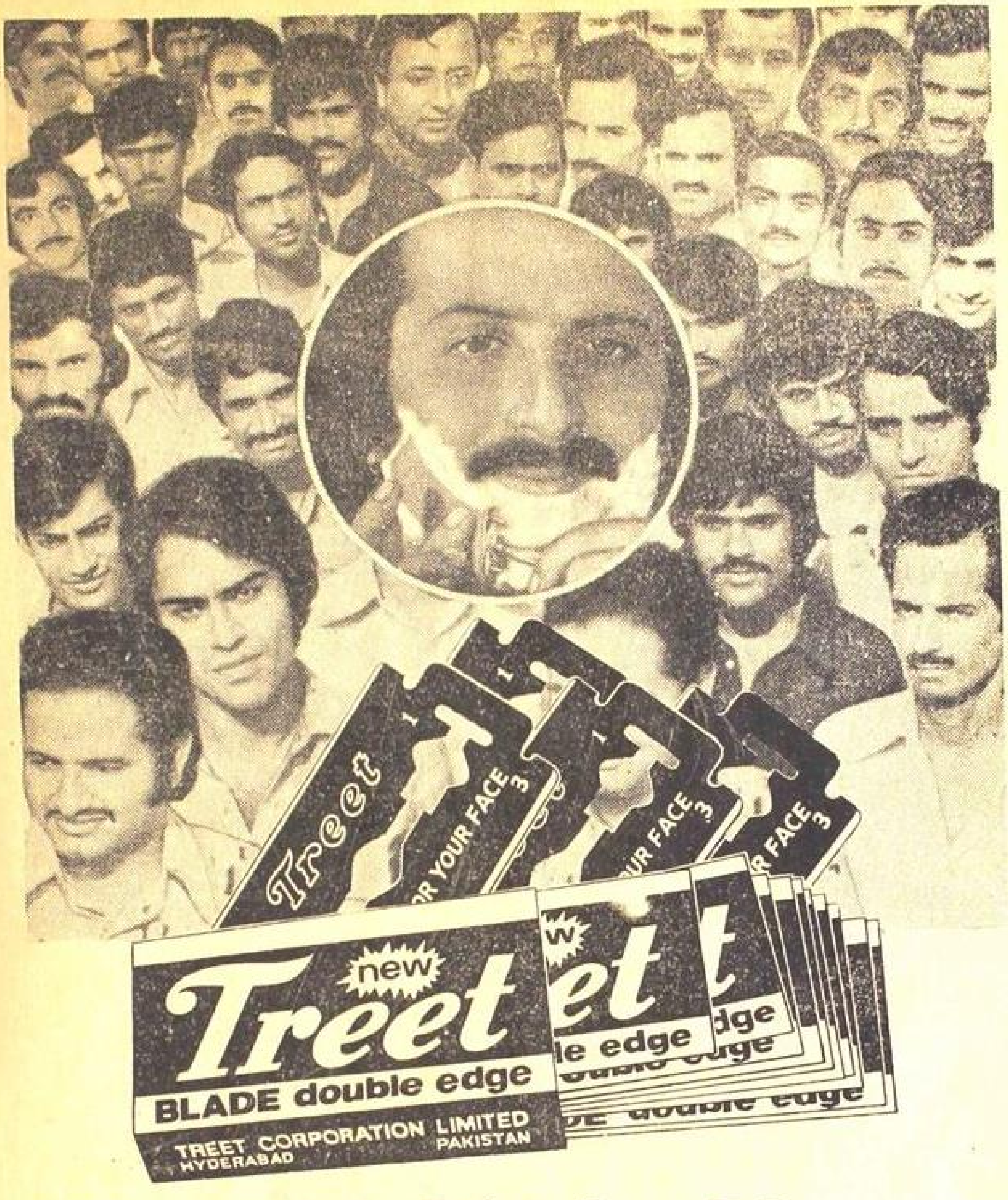
کُھلا نہیں ہے درِ شہرِ اختیار ابھی
کچھ اور دیر یونہی قیدِ ماہ و سال میں رہ

دل و زباں میں اگر ارتباط رکھنا ہے
تو ہنس کے رنج اُٹھا مت کسی ملال میں رہ

یونہی تو بچ نہیں سکتی ضمیر کی دولت
اگر عزیز خودی ہے شکستہ حال میں رہ

رضائے اہلِ کرم بھی یہی ہے اے جالبؔ
نہ کر سوال مگر حالتِ سوال میں رہ

حبیب جالب



جانا پہچانا - آزمایا ہوا

ٹریٹ بلیڈ

سال ہا سال سے آپ کی طرح لاکھوں افراد ٹریٹ بلیڈ سے صاف ستھرا اور آرام دہ شیو کر رہے ہیں اور اس کے اعلیٰ معیار سے مطمئن ہیں۔

بلیڈ سازی کا ہمارا وسیع تجربہ آج کی طرح کل بھی ٹریٹ بلیڈ کے اعلیٰ معیار کی ضمانت ہے۔

PRESTIGE TB. 74.2.76

WITH TWO PRESIDENTS

Major C. L. Datta

دو صدروں کے ساتھ

ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر رادھا کرشنن
کے اے ڈی سی میجر دتہ کے قلم سے

ترجمہ : ف ۔ م ۔ ماجد

- بھارتی صدر نے دیر تک ملکہ برطانیہ کا ہاتھ پکڑے رکھا۔
- ملکہ برطانیہ کی دوست ایوانِ صدر میں زار و قطار رو رہی تھیں۔
- ملکہ پریشان ہو گئیں ـــــ ان کے شوہر غائب تھے۔
- ڈیوک آف ایڈنبرا بھارتی خاتون کے ہاتھ تھامے کہہ رہے تھے "اب تو تمہارے دکھ دور ہو گئے"
- ملکہ نے ایوب خان کی حمایت کی ۔ بھارتی سیاست دان ناراض ہو گئے۔
- میں نے نہرو کو بتایا "ملکہ آپ کی منتظر ہیں" ـــــ انہوں نے جواب دیا "تو میں کیا کروں"!
- صدر نے کہا "میں بیس سال آپ کے باپ کی جیل میں رہا ہوں"!
- نہرو خوب صورت عورتوں کے قرب میں رہنا پسند کرتے تھے۔
- بھارتی جرنیل نے امریکی نائب صدر کی بیوی سے خاندانی منصوبہ بندی پر گفتگو شروع کر دی۔
- بھارت کے فوجی راز ملک سے باہر چلے گئے۔

بھارت کے ایوانِ صدر میں

حماقتیں ـ سازشیں ـ وارداتیں

یہ جنوری ۱۹۶۱ء کی بات ہے۔

ملکہ برطانیہ اور ڈیوک آف ایڈنبرا بھارت کے دورے پر پہنچے
ان سے پہلے ہندوستان کا دورہ کرنے والے آخری تاجدار برطانیہ ملکہ الزبتھ کے دادا جارج پنجم تھے جنہوں نے ۱۹۱۱ء میں یعنی پورے پچاس سال پیشتر اس سرزمین پر قدم رنجہ فرمایا تھا۔ ملکہ الزبتھ ہندوستان کی آزادی کے بعد یہاں کا دورہ کرنے والی پہلی برطانوی حکمران تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے خاوند پرنس فلپ ڈیوک ایڈنبرا بھی تھے۔

رائل ایئر فورس کا "دی بی۔ یٹن" (بریٹینیا) شاہی مہمانوں کو اپنی آغوش میں لیے جب پالم کے ہوائی اڈے پر پہنچے سرخ قالینوں کے قریب آ کر رکا، تو استقبال کرنے والا ہجوم منتظر کھڑا تھا۔ بائیں جانب نہرو گورنمنٹ کے اراکین اور سفارتی نمائندے کھڑے تھے۔ ان کے بعد دہلی کے میئر، نور الدین احمد، کی قیادت میں معزز شہریوں کی طویل قطار تھی۔ ۔۔۔ ایئرین (جہاز کھڑا کرنے کی جگہ) کے آخری سرے پر اور ان اہم شخصیات سے دور رسوں کے ذریعہ ایک باڑے کے اندر عام پبلک جمع تھی۔ سلامی کے چبوترے کو خوشنما طور پر سجایا گیا تھا۔ اور مائیکروفونوں کی کثیر تعداد مہمان اور میزبان کی تقریروں کو اپنے اندر جذب کرنے کی منتظر تھی ـــ جہاز کے دروازے پر سیڑھی لگائی گئی تھی۔ سیڑھی کے اوپر کے پلیٹ فارم پر ہلکے نیلے رنگ کے چمکدار لباس

میں ملبوس، ملکہ معظمہ نمودار ہوئیں۔ انہوں نے پنکھڑیوں کی شکل کا سفید ہیٹ پہن رکھا تھا عقب میں ڈیوک آف ایڈنبرا گہرے نیلے رنگ کا سوٹ پہنے کھڑے تھے۔

ملکہ پہلی بار ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ تو صدر نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے پروٹوکول کی اجازت سے کچھ زیادہ دیر تک ہی ملکہ کا ہاتھ تھامے رکھا! پنڈت نہرو نے جو اس سے پیشتر کئی بار کامن ویلتھ کانفرنسوں میں ملکہ سے مل چکے تھے، مسکراتے ہوئے سفر کے بخیریت طے ہونے کے بارے میں پوچھنے پر ہی اکتفا کی۔ شہزادہ فلپ کے ہونٹوں پر اگرچہ تھوڑی سی مسکراہٹ تھی، تاہم وہ کافی حد تک کھلکھلا رہے تھے!

خوش آمدید کے کلمات کے بعد چیف آف پروٹوکول، ایم۔ آر۔ اے بیگ نے سفارتی نمائندوں کو ملکہ سے متعارف کرانا شروع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مسٹر بیگ کو نہ صرف تمام سفارتی نمائندوں کے صحیح نام ازبر تھے، بلکہ وہ ان کے ماضی اور حال سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ اب معزز شہریوں کی باری آئی۔ یہاں سے فارغ ہو کر ملکہ سلامی کے چبوترے پر کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے صدر کے خطبۂ استقبالیہ کے جواب میں اپنی قدرتی طور پر باریک اور قدرے اونچی آواز میں حاضرین کو بتایا کہ وہ اپنی مدت کی خواہش یعنی ہندوستان آنے کے خواب کو پورا ہوتے دیکھ کر بیحد مسرور تھیں!

شاہی پارٹی کا جلوس پورے رسمی اعزاز کے ساتھ راشٹرپتی بھون کو روانہ ہوا۔ بھون کے بیرونی صدر دروازے سے باڈی گارڈ (جس میں شاندار وردیوں میں ملبوس، ایک سو اکتالیس گھڑسوار شامل تھے) شاہی جلوس کا ہراول دستہ بن کر آگے آگے روانہ ہوا۔ صدر کا سارا ذاتی سٹاف ساؤتھ کورٹ کے باہر استقبال کے لیے اپنی سینیارٹی کے مطابق لائن میں کھڑا تھا۔ دستور کے مطابق ان کا تعارف سب سے پہلے ملکہ، پھر ڈیوک آف ایڈنبرا اور آخر میں ملکہ کے ذاتی سٹاف سے کرایا گیا (جس کے سربراہ ارل آف سکاربرو تھے) اس سٹاف میں ایک کیپٹن پیٹر بارو بھی شامل تھا، جس کا باپ آزادی سے پہلے دہلی میں وائسریگل لاج کا کمپٹرولر رہا تھا ــ لیڈی روز بیرنگ ملکہ کی خصوصی مصاحبہ تھیں اور یہ لیڈی بعد میں ایک نازک صورت حال کی ذمہ دار ثابت ہوئیں (جب ملکہ ایک دورہ پر دہلی سے باہر تھیں) ہوا یوں کہ لیڈی صاحبہ اپنی (یا اپنے) کسی دوست کے ہاں رات کا کھانا وغیرہ کھا کر ڈیڑھ بجے کے بعد بھون لوٹیں، تو انہیں اپنے پرس میں کمرے کی چابی نہ مل سکی۔ قاعدے کے مطابق انہیں یہ چابی کمرے کی خادمہ کے سپرد کر کے جانا چاہیے تھا۔ ساؤتھ کورٹ کے ڈیوٹی گارڈ نے مجھے فون کر کے جگایا اور کہا کہ زنانی صاحب کے ساتھ آنے والی ایک

بیگم صاحبہ اپنے کمرے کے باہر کھڑی رو رہی ہے!" بھون کے سب تالوں کو کھولنے والی ماسٹر کی "منگوا کر ان کا کمرہ کھلوایا گیا، تب کہیں روتی ہوئی بیگم صاحبہ رات کا بقیہ حصہ اپنے کمرے میں گزارنے کے قابل ہو سکیں۔

راشٹرپتی بھون میں قیام کے دوران ملکہ کو دوارکا سوئٹ میں ٹھہرایا گیا جب کہ ڈیوک ان سے متصل سوئٹ میں ٹھہرے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ملکہ نے اپنی مرضی سے علیحدہ قیام کرنا پسند کیا تھا یا یہ پروٹوکول کی کوئی مصلحت تھی! دوارکا سوئٹ ایک بیڈ روم، ایک سائیڈ روم اور ایک باتھ روم پر مشتمل ہے۔ باتھ روم میں سنگ مرمر کا بڑا باتھ ٹب ہے، جس کے گرد وحشی ہنسوں کا احاطہ ہے اور اس کے اوپر شاور ہیں جو ایلومینیم کی پرکھلوں کے ذریعے دیوار میں جڑے ہیں۔ بیڈ روم اور سائیڈ روم کی دیوار، دن بھر میں ساگوان کے تختے لگے ہیں۔ سونے کے لیے پلنگ خاص صندل کی لکڑی کا بنا ہے اور سے سُرخ مخمل سے سجایا گیا ہے۔ بیرون ملک اور اندرون ملک بات کرنے کے لیے علیحدہ علیحدہ ٹیلی فون سیٹ ہیں۔ اپنے قیام کے دوران میں ملکہ باقاعدگی سے روزانہ رات کو لندن میں اپنے بچوں سے ٹیلی فون پر بات چیت کرتی رہیں۔

جب ملکہ کی قیام گاہ کو تیار کیا جا رہا تھا، تو بھارتی حکومت اور برطانوی ہائی کمیشن کے سیکیورٹی افسران نے اچھی طرح تفتیش کر لی تھی کہ کہیں خفیہ کیمرے، ٹیپ ریکارڈ یا مائیکروفون نصب نہ کر دیے گئے ہوں۔

ملکہ اپنی ساری مصروفیات میں وقت کی پابندی پر سختی سے عمل کرتی رہیں، تاہم انہیں ایک بار لیٹ ہونا پڑا اور وہ بھی پرنس فلپ کی وجہ سے! جب ایک ثقافتی شو میں شرکت کے لیے روانگی کا لمحہ آیا تو پرنس فلپ کو کہیں بھی نہ پایا۔ ملکہ ان کے انتظار میں بار بار گھڑی دیکھ کر پریشان ہو رہی تھیں۔ آخر انہوں نے زیادہ انتظار مناسب نہ سمجھا اور اے ڈی سی کو روانہ ہونے کے لیے کہہ دیا۔ عین اسی وقت جب کہ وہ پورچ میں کھڑی کار کے اندر داخل ہو رہی تھیں، تو ڈیوک آف ایڈنبرا لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے آکر ان کے ہمراہ ہو گئے!

ہم راشٹرپتی بھون کے باسیوں کو ملکہ کو قریب سے دیکھنے کے کئی مواقع حاصل ہوئے۔ میرے خیال میں وہ اپنی تصویروں سے کافی حد تک مختلف تھیں۔ ان کا قد مشکل سے پانچ فٹ ایک انچ ہوگا اور جسم کافی دبلا پتلا۔ آنکھوں کے نیچے جھریاں ان کی اصل عمر کی غمازی کرتی ہیں۔ شاید اسی لیے وہ پبلک میں نمودار ہونے سے پہلے گہرا میک اپ کرنے کی عادی ہیں۔ ہم نے انہیں اکثر لفٹ میں لگے ہوئے آئینہ میں خود کو پرکھتے ہوئے پایا! انہیں ناخنوں پر پالش لگانے کا بھی کافی شوق ہے اور موقعہ بے موقعہ اپنے ہیئر کو درست کرتی رہتی ہیں ۔۔۔ جب راشٹرپتی بھون سے باہر جاتیں اور لوگوں کے ہجوم انہیں دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو جاتے تھے، تو ان کا ہاتھ ہلا کر سلامی دینے کا انداز بڑا منفرد تھا۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ وہ اخلاقی یا رسمی حدود سے بڑھ کر مسکرانا یا ہاتھ ہلانا پسند نہیں کرتیں۔

ملکہ کے مقابلے میں پرنس فلپ کا قد اور بھی لمبا معلوم ہوتا ہے۔ ان کے سر پر بال کافی کم ہو چکے ہیں، مگر ان کی شخصیت میں کوئی ایسی بات ہے جو مردوں، عورتوں سبھی کو یکساں طور پر متاثر کرتی ہے۔ وہ دیکھنے لیے دیے ہیں مگر تیزی سے بات کرتے ہیں۔ شاہی جوڑے کے دہلی میں قیام کے دوران انہیں بے شمار پرستاروں کے خطوط موصول ہوتے رہے، جنہیں ان تک پہنچانا میری ڈیوٹی تھی!

مجھے ۵ فروری ۱۹۶۱ء کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ جس دن ملکہ اور پرنس کو صدر کے ایک عصرانہ میں شریک ہونا تھا۔ شاہی جوڑا بھون کے لان میں داخل ہوا۔ اس کے بعد ملکہ دائیں جانب مڑ گئیں اور پرنس فلپ بائیں جانب۔ دونوں الگ الگ مہمانوں سے ملاقات کر رہے تھے۔ اس روز میری ڈیوٹی پرنس کے ساتھ تھی۔ لان کا چکر مکمل کرنے کے بعد پرنس ایک گروپ سے بات چیت کرنے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ازراہ مذاق ایک آدمی مجھ سے دریافت کیا کہ بھون کے اردگرد خاردار تاروں کا مقصد اسے اندر بند رکھنا تھا یا دوسرے لوگوں کو باہر روکنا تھا۔ بے چارہ نوجوان افسر گھبرا کر بولا: "یہ دونوں باتیں ممکن ہیں!" ابھی مجھ کا جواب پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ ڈیوک کی نظر کچھ دور کھڑی ایک خاتون پر پڑی جو بہت شوخ اور بھڑکیلا لباس پہنے وارفتگی کے عالم میں انہی کو دیکھ رہی تھی۔ پرنس فوراً اس کے قریب پہنچے اور اس سے اس کا نام پوچھا۔ خاتون نے نام تو نہیں بتایا مگر فوراً ہی تقریر شروع کر دی: "یور رائل ہائینس! میں بچپن ہی سے آپ کی بڑی مداح رہی ہوں۔ میں نے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہونے والی آپ کی ایک ایک تصویر جمع کر رکھی ہے۔ میں نے آپ کو بے شمار خطوط بھی لکھے، مگر آج تک آپ کی طرف سے جواب سے محروم رہی ہوں۔ جب دو سال قبل آپ یہاں انٹرنیشنل سائنس کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے، تو میں اس وقت بھی آپ کی پرستار تھی لیکن میں اپنی بہن کی شادی میں شامل ہونے کے لیے پٹیالہ میں تھی اور آپ کے درشن سے محروم رہ گئی۔ آج میری زندگی کا روشن ترین دن ہے۔" خاتون سانس لینے کے لیے رکیں، تو پرنس نے اپنے معروف اور پوری طرح دل موہ لینے والے انداز میں اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھام کر کہا: "اے عزیز خوبصورت نوجوان خاتون! اب تو تمہارے سارے شکوے دور ہو گئے ہوں گے!"

ملکہ الزبتھ اپنے بھارتی دورے کے درمیان ہی پاکستان اور نیپال کا چکر لگانے روانہ ہو گئیں۔ بھارتی اخباروں میں ان کا وہ بیان شائع ہوا تھا، جس میں انہوں نے پاکستان کی "بنیادی جمہوریت" کی تعریف کی تھی، جسے ہم بھارتی لوگ ڈکٹیٹر شپ پر پردہ ڈالنے کی کوشش سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے، ملکہ کے بیان نے بھارت کے سرکاری حلقوں میں اعتراضات اور تنقید کی راہ کھول دی۔ ایک بار وزیراعظم کو صدر سے کہتے سنا گیا کہ پاکستان کی ڈکٹیٹر شپ کی تعریف کرنا بچگانہ حرکت ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کے بعد ملکہ کی پاکستان سے واپسی کے وقت پالم کے ہوائی اڈے کا واقعہ ارادی تھا یا اتفاقی! میں صدر کے نمائندے کی حیثیت سے ہوائی اڈہ پر موجود تھا، یہ سولہ جنوری کی بات ہے، ملکہ کا طیارہ پورے ساڑھے نو بجے وی آئی پی احاطہ میں آکر رکا، تو اس وقت پنڈت نہرو برطانوی ہائی کمشنر سر پال گور بوتھ سے گفتگو میں مصروف تھے۔ سر پال کافی اونچا سنتے تھے۔ اس لیے نہرو زور زور سے بات کر رہے تھے۔ لیکن ایسا بھی کیا کہ انہیں طیارہ کی آمد کا پتہ نہ چلا ہو! طیارے کا دروازہ کھل چکا تھا اور سیڑھی لگائی جا رہی تھی۔ اس کے بعد ملکہ دروازے میں نمودار ہوئیں، تو نہرو نے اسی طرح ادھر پشت کیے ہائی کمشنر اور لیڈی بوتھ کو باتوں میں الجھائے رکھا۔ طیارہ کا عملہ پھرتی سے اتر کر سیڑھی کے ساتھ لان میں کھڑا ہو چکا تھا۔ بیچارہ ہائی کمشنر شدید اضطراب کے عالم میں نہرو کے شانے کے اوپر سے ملکہ کو دروازے میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ نہرو اسی بے نیازی سے اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھے۔ پاس آداب سر پال کو نہ وزیراعظم کو چھوڑ کر چل دینے کی اجازت دیتا تھا اور نہ ہی ملکہ کی موجودگی میں وہاں رکے رہنے کی! دستور کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی وجہ سے وزیراعظم استقبال نہ کر سکیں، تو صدر یا ان کا نمائندہ مہمان کا استقبال کرتا ہے۔ میں معاملہ کو مزید بگڑنے سے بچانے کے لیے عجلت میں پنڈت جی کے قریب گیا اور سرگوشی میں انہیں بتایا کہ ملکہ عالیہ منتظر ہیں۔ پنڈت نہرو نے بغیر کسی پریشانی کا اظہار کیے میری طرف دیکھ کر کہا: "تو میں کیا کروں؟" میں نے جواب دیا کہ انہیں جا کر استقبال کرنا چاہیے۔ تب ایک لمحہ کی پس و پیش کے بعد پنڈت جی اپنی روایتی مسکراہٹ لبوں پر سجائے سیڑھی کے پاس پہنچے۔ اس وقت تک ملکہ سیڑھی کے سب سے نچلے زینے پر پہنچ چکی تھیں! پسینہ میں تر بتر برطانوی ہائی کمشنر اور سب حاضرین نے اطمینان کا سانس لیا!!!

یکم مارچ کے روز ملکہ اپنے دورے کے اختتام پر وطن روانہ ہونے والی تھیں۔ صدر نے انہیں صندل کی لکڑی کی ایک بیش قیمت جڑاؤ اور منقش تصویر پیش کی جو سونے اور ہاتھی دانت کے کام والے فریم میں نصب تھی۔ اس تصویر میں مہابھارت کی جنگ کا ایک سین دکھایا گیا تھا۔ جب مہاراج کرشن ارجن دیو کو جنگی فرائض ادا کرنے پر تیار کر رہے تھے۔ یہ ہندوستانی قدیم آرٹ کا بہترین نمونہ تھا۔ ملکہ یہ تحفہ وصول کر کے بہت خوش ہوئیں اور انہوں نے بھگوت گیتا کے متعلق چند سوال بھی کیے۔

روانگی سے ذرا دیر پہلے جوابی تحفے کے طور پر ملکہ اور پرنس فلپ نے صدر کو چاندی کا ایک قلمدان پیش کیا، جس پر دونوں کے دستخط منقش تھے۔ صدر کی سٹڈی میں اس وقت ان تینوں کے علاوہ مسز وجے لکشمی پنڈت، مسٹر بیگ، اور ملٹری سیکرٹری بھی موجود تھے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ملکہ اپنے تحفے کی کم مائیگی کو محسوس کر رہی تھیں۔ مگر صدر نے اپنی روایتی سادگی سے یہ کہہ کر ان کو شرمندگی سے بچا لیا: "تحفے کی قدر و قیمت اس کی شکل یا جسامت کے برعکس خلوص اور محبت پر مبنی ہوتی ہے۔" اس کے ساتھ ہی مسٹر بیگ نے مناسب ڈپلومیسی سے

کام لیتے ہوئے موضوع موڑ دیا اور کہا: جناب صدر آج کل اپنی سوانح حیات لکھنے میں مشغول ہیں۔ وہ یور مجسٹی کے اس قلمدان سے اس میں ایک نیا باب شامل کریں گے "!

ملکہ اس پر مطمئن ہو کر صدر سے پوچھنے لگیں "کیا واقعی ؟" اور صدر نے انہیں بتایا کہ بیشک مسٹر بیگ کا کہنا درست تھا اور وہ اس وقت تک چند باب ختم ہو چکے تھے۔ اس پر ڈیوک نے استفسار کیا کہ وہ کتنا کام مکمل کر چکے ہیں۔ صدر نے بتایا کہ تقریباً بارہ سو صفحات لکھے جا چکے تھے۔ ملکہ نے بہت تعجب سے دریافت کیا کہ اس کام کے لیے انہیں وقت کیسے میسر آ جاتا تھا۔

صدر نے نہایت سکون کے ساتھ جواب دیا: "یور مجسٹی! میں اس کام میں بہت عرصے سے مشغول ہوں، آپ مت بھولیے گا کہ میں سولہ سال تک آپ کے والد محترم کی جیلوں میں رہا ہوں، جہاں فرصت ہی فرصت تھی "!

صدر کے اس فقرے کے بعد جو خاموشی پھیل گئی، اس کا اثر بم کی آواز سے بھی زیادہ تھا! ہم سب ہکا بکا رہ گئے۔ مسٹر بیگ سمیت کسی کو اس مہلک فقرے کی کاٹ زائل کرنے والی کوئی بات نہ سوجھ سکی۔ مسز پنڈت (جو خود بھی سالہا سال تک ایسے ہی جیلوں میں زندگی گزار چکی تھیں) کے چہرے کے تاثرات قابلِ دید تھے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا۔ پھر مسٹر بیگ پر نظر ڈالی اور پھر کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرنے میں مصروف ہو گئیں! — ابتدائی صدمہ کی لہر پر ذرا تھمیں، تو مسٹر بیگ نے دہلی کے موسم پر ایک کمزور سا تبصرہ کیا۔ اس کے فوراً بعد صدر پر دمہ کا شدید دورہ پڑا اور میں فوراً ان کا انیل پمپ لے کر ان کی تکلیف رفع کرنے پر جت گیا — ملکہ غیر ضروری سرعت سے خدا حافظ کہہ کر مسز پنڈت کے ہمراہ سٹڈی سے رخصت ہو گئیں۔ پرنس فلپ نہایت اطمینان سے ان کے چند قدم پیچھے روانہ ہو گئے "!!!

صدر نے ملکہ کے اعزاز میں الوداعی دعوت دی، تو وہ پروٹوکول کے مطابق وقت مقررہ سے پندرہ منٹ پہلے اپنے سیکرٹری اے ڈی سی کے ہمراہ ملکہ کے سویٹ میں پہنچے اور وہاں سے دوسرے افسران کی معیت میں ملکہ کو جلو میں لیے ہوئے "دوارکا سویٹ" سے "اشوک ہال" کی طرف روانہ ہوئے، جہاں ضیافت کے مدعوین ایک کھلے مربع کی شکل میں کھڑے تھے۔ میزبان اور مہمان شاعر نظامی کی قدِ آدم تصویر کے سامنے ایک مرتفع چھتر کے نیچے کھڑے تھے۔ "جن من گن" (قومی ترانہ) کے بعد دوسرے مہمانوں کو ملکہ سے متعارف کرایا گیا — اس سے پہلے "دوارکا سویٹ" سے روانہ ہوتے ہوئے ملکہ نے دیواروں پر لگی تصویروں کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور قریب کھڑے ہوئے ایک جرنیل سے کہا: "جنرل! آپ یورپ گئے ہوں گے اور وہاں کا آرٹ بھی ضرور ملاحظہ کیا ہوگا۔ مونا لزا کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" اتفاق سے ملکہ نے جس مخاطب کا انتخاب کیا تھا، ان جنرل صاحب کی معلومات عامہ کی حدود بے حد مختصر تھیں (وہ خود بھی اپنی کمزوری سے واقف تھے اور اکثر کہا کرتے تھے: "میں صرف ایک جنرل ہوں، جس کے ساتھ نائیک کا

خروشیف مسز جیکولین کو دیکھتے ہی نرم پڑ گیا

لفظ منسلک نہیں "! ان حضرات نے زندگی میں کبھی "مونا لزا" کا نام سنا ہوگا، چنانچہ انہوں نے ادھر اُدھر دیکھا کہ شاید کسی طرف سے کوئی اشارہ مل سکے۔ کسی نے کچھ کہا، تو ان کے کان میں "لیڈی" کا لفظ پڑا، چنانچہ انہوں نے مزید تکلف کیے بغیر ملکہ سے مخاطب ہوتے ہوئے جواب دیا: "جی ہاں یور مجسٹی! وہ نہایت پرکشش خاتون ہیں اور میں نے لندن میں ان کا نہایت کامیاب شو دیکھا تھا" — اس جملے کے فوراً بعد ایک پھرتیلے فوٹوگرافر نے ملکہ کی جو تصویر کھینچ لی، وہ شاید ان کی زندگی کی بہترین تصویر تھی!

امریکی صدر کی بیوی مسز جیکولین کینیڈی ۱۲ مارچ ۱۹۶۲ء کو نو دن کے دورے پر ہندوستان آئیں۔ ان کے ساتھ ان کی بہن پرنسیس رازی ول بھی تھیں۔ راشٹرپتی بھون کے مکینوں نے بھی مسز کینیڈی کی مسحور کن شخصیت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ ہم یہ بھی جانتے تھے کہ خروشیف جیسا کرخت شخص بھی ویانا میں ان سے پہلی ملاقات ہی میں نرم پڑ گیا تھا! صدر کینیڈی کو بھارت کے اچھے دوستوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس لیے ہمیں مسز کینیڈی کے دورے کا اشتیاق سے انتظار تھا۔ عام لوگ انہیں "امریکن رانی" کے لقب سے یاد کرتے تھے!

نہرو ہمیشہ سے خوبصورت عورتوں کے قرب میں رہنا پسند کرتے رہے تھے۔ اس لیے جیکولین کو وزیرِ اعظم کی سرکاری رہائش گاہ میں قیام کرنے کی دعوت دی گئی (حالانکہ ایک صدر کی بیوی کی حیثیت میں انہیں راشٹرپتی بھون میں رہنا چاہیے تھا) ایک بیڈ روم کو خاص طور پر ہندوستانی ساز و سامان سے آراستہ کیا گیا، جن میں صندلی دیوان، اصلی ریشم کے بانیک پردے، کھدّی کے بستر پوش اور اسی طرح کے دستکاری کے اور نمونے شامل تھے۔ اس اہتمام کا مقصد صاف طور پر امریکہ کی خاتونِ اوّل کو متاثر کرنا تھا۔

مسز کینیڈی اور پرنسیس کا خصوصی طیارہ فجر سے کافی پہلے پالم کے ہوائی اڈے پر اترا۔ اسی دن گیارہ بجے صدر سے ملاقات سے پیشتر انہوں نے دونوں ایوانوں کا اجتماعی اجلاس دیکھا جس سے صدر نے خطاب کیا تھا۔ بعد میں وہ اپنی بہن کے ہمراہ نارتھ کورٹ روانہ ہو گئیں، جہاں صدر نے "مارننگ روم" میں ان کا استقبال کیا۔ صدر کے دائیں جانب مسز کینیڈی تھیں اور بائیں جانب پرنسیس رازی ول امریکہ میں بھارتی سفیر مسز کینیڈی کے دائیں ہاتھ بیٹھ گئے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ صدر کو دونوں بہنوں کے صحیح تشخص میں دشواری تھی — انہوں نے مسز کینیڈی کی خوبصورتی کے چرچے ضرور سن رکھے ہوں گے "لیکن یہاں دونوں بہنیں ایک جیسی خوبصورت لگ رہی تھیں ورنہ شاید صدر کے لیے آسان ہو جاتی "! چنانچہ صدر نے اپنے ہی طور دل میں کچھ فیصلہ کرنے کے بعد اپنی توجہ پرنسیس کی طرف مرکوز کر دی۔ اس پر مسز کینیڈی اور سفیر کچھ محظوظ بھی ہوئے۔ سفیر راشٹرپتی کے نہرو والے رخ سے صورتحال واضح کرنے کی غرض سے مسز کینیڈی کی طرف واضح

اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ابھی ابھی صدر کا پارلیمانی خطاب سن کر آ رہی ہیں۔ مگر یہ دوا بھی خالی گیا کہ صدر ایک بار پھر پرنسیس رازی ول سے مخاطب ہو کر بولے: "اچھا اچھا! تو کیسے آپ کو ایوان کی کارروائی کیسی لگی؟"

بعد میں صدر نے مہمانوں کو اپنی دو دستخط شدہ تصویریں پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی اور میری ڈیوٹی یہ لگی کہ میں ان کی دلی سے روانگی سے پیشتر ان کے حوالے کر دوں۔ میں تصویریں لے کر "پرائم منسٹر ہاؤس" گیا۔ مسز کینیڈی مجھ سے بڑے اخلاق سے پیش آئیں۔ انہوں نے تصویر کو کاغذوں کے اندر سے نکالتے ہوئے بچوں کے سے معصوم تجسس کا اظہار کیا اور چاندی کے فریم میں جڑی ہوئی تصویر پا کر بہت خوش ہوئیں۔ میں نے مشاہدہ کیا کہ زندگی کے بارے میں مسز کینیڈی کا نقطۂ نظر بہت سادہ اور پاکیزہ تھا — ان کی جسمانی خصوصیات یہ ہیں: ان کا چہرہ کسی حد تک تکونا ہے اور ان کی آنکھوں کا درمیانی فاصلہ غیر معمولی طور پر زیادہ ہے۔ ان کا قد عام ہندوستانی عورت کے مقابلے میں زیادہ لمبا ہے اور دیکھنے والے کو ان کے بازوؤں وغیرہ کے پٹھوں سے تن سازی کے اثرات کا احساس ہوتا ہے، مگر اس کے باوجود ان میں بدرجہ اتم نسائیت ہے، خاص طور پر ان کے اندازِ گفتگو میں (دھیمے الفاظ میں گفتگو کرتے ہوئے کسی وقت ان کی آواز بڑے دلکش طور پر کھرج طائفہ میں اتر جاتی ہے اور مخاطب کو یوں لگتا ہے جیسے وہ خواب میں سرگوشی کر رہی ہوں!) مسز کینیڈی بڑی نہایت پرکشش اور من موہنی خاتون ہیں۔

مسز کینیڈی کے ساتھ بیٹھے بیٹھے میں نے ان کا ایک ناپختہ سا خاکہ تیار کر لیا جسے راشٹرپتی بھون واپس پہنچ کر میں نے صاف کرنے کے بعد آئل پینٹنگ میں تبدیل کر دیا۔ دوسرے دن امریکن سفارت خانہ کے استقبالیے میں میں نے وہ تصویر مسز کینیڈی کو پیش کی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے مجھے خاص کمرے میں شرفِ ملاقات بخشا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ تصویر کسی قابل تھی یا نہیں، لیکن خاتونِ اوّل نے پسندیدگی کا اظہار کیا اور اپنے ساتھ مشابہت کی تعریف کی۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس تصویر کو صدر کینیڈی کے بیڈ روم یا سٹڈی میں لگوائیں گی۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ وہ سچ مچ میری بنائی ہوئی تصویر اپنے ساتھ وائٹ ہاؤس لے گئیں۔

مسز کینیڈی گھڑ سواری میں حیرت انگیز مہارت رکھتی ہیں۔ نئی دہلی کے قیام کے دوران وہ پابندی سے اس ورزش کے لیے وقت نکالتی رہیں۔ اس کام میں ایک ماہر ہندوستانی افسر ان کا ساتھ دینے پر مامور تھا۔ ایک روز وہ بے چارہ ایک رکاوٹ عبور کرتے ہوئے گھوڑے سمیت دھڑام سے نیچے آ رہا، تو ہندوستانی پریس میں اس کا بہت مذاق اڑایا گیا — مسز کینیڈی اپنے دورے کے اختتام تک اس افسر کی خیریت دریافت کرتی رہیں۔

۱۰ مئی ۱۹۶۱ء کو نائب صدر، لنڈن جانسن بھی دنیا کے سفر کے دوران میں اپنی بیگم (لیڈی برڈ) کے ہمراہ ایک دن کے لیے دہلی

ہیں رہے۔ انہیں بھی پورے رسمی اعزاز کے ساتھ خوش آمدید کہا گیا جو عام طور پر صرف کسی سربراہ مملکت کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ انہیں بھی دوورکا سوئٹ میں ٹھہرایا گیا۔ وقت کم تھا، مگر تقریبات کی بڑی بھرمار تھی۔ اس کے باوجود ان سے ملاقات کے لیے صدر کے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی چھوٹی سی فوج پہنچ گئی۔ اس شام کو سرکاری استقبالیہ سے پہلے مسٹر جانسن اور ان کی بیگم کمرے میں سستا رہے تھے کہ یہ بچے جن کی عمریں چودہ سے اکیس سال تک تھیں، بغیر اطلاع کیے وہاں پہنچ گئے۔ مسٹر اور مسز جانسن دونوں جس حال میں تھے، اسی طرح کمرے سے باہر آگئے۔ اس طرح کہ مسز جانسن ایک قدرے بوسیدہ گاؤن میں تھیں اور ان کے بالوں میں کرلرز لگے تھے۔ نائب صدر قمیض اور پتلون میں تھے۔ بچوں کی لیڈر صدر کی سب سے بڑی غیر شادی شدہ نواسی "تارا" تھی، جو ایک غیر معمولی طور پر ذہین لڑکی تھی۔ ان کے ساتھ صدر کے سٹاف کا ایک سینئر افسر بھی تھا، جو گفتگو میں پتھر مار دینے کے لیے مشہور تھا۔ تعارف ہو چکے، تو اس کے بعد دونوں طرف خاموشی طاری ہو گئی۔ اب بچوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا گفتگو کریں۔ ادھر جانسن جلدی سے کمرہ میں واپس جا کر اپنا قیلولہ جاری رکھنا چاہتے تھے۔ ایک اے ڈی سی نے خاموشی توڑنے کی خاطر کہنا شروع کیا "مسٹر جانسن آپ لوگوں کے لیے وہ دن واقعی یادگار رہے گا، جس دن کمانڈر ایلن شیپرڈ اپنا خلائی ٹوپ مکمل کر کے زمین پر واپس آیا تھا۔"

کمانڈر شیپرڈ کا کارنامہ امریکیوں کا محبوب موضوع تھا، کیونکہ اس سے پہلے روسی اپنے خلاباز گاگارین کو دنیا کے گرد پہلی بار خلائی چکر لگوا کر امریکہ پر سبقت حاصل کر چکے تھے۔ مسز جانسن کے لیے بھی یہ موضوع باعث مسرت تھا: "جی ہاں وہ دن ہماری تاریخ میں بڑا اہم ہے۔ ہم ٹیلی ویژن سے نظریں ہٹا ہی نہیں سکے تھے۔ لنڈن تو اس وقت سائٹ پر گئے ہوئے تھے۔" ان کا چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا اور وہ تین چار منٹ تک اسی رو میں بولتی چلی گئیں اور "ایل بی جے" مسکرا مسکرا کر ان کی خوشی میں شرکت کر رہے تھے۔

مسز جانسن بات ختم کر چکیں، تو جرنیل صاحب (یعنی ان سینئر سٹاف افسر) نے گفتگو میں حصہ لینا ضروری سمجھا۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی بھی تھیں جنہوں نے اپنے خاوند کی عادت سے واقف ہونے کے باعث ان کو روکنے کی نیت سے چپکے سے ان کی پتلون کو جھٹکا دیا، مگر جرنیل صاحب نے خاموش رہنا اپنی توہین سمجھی۔ انہوں نے اے ڈی سی کو "ٹوپ" الفاظ استعمال کرتے، تو سن ہی لیا تھا۔ اس سے انہوں نے اس امریکن "ٹوپ" کی مراد وہی چیز سمجھی جس کا ذکر ان دنوں خاندانی منصوبہ بندی کے پروپیگنڈہ میں کثرت سے ہوتا تھا، چنانچہ جرنل صاحب نے بڑی سنجیدگی سے فرمایا "جی ہاں، مسز جانسن مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ چیز امریکہ میں بھی کافی کامیاب ثابت ہوئی ہے"۔ مسز جانسن نے حیران ہو کر کہا: "کرنل! میں سمجھی نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں" (انہوں نے کرنل کا لفظ شاید اس لیے استعمال کیا کہ امریکی صدر کے ذاتی سٹاف ممبر کا زیادہ سے زیادہ رینک یہی ہو سکتا ہے) اس پر مسز جانسن نے قبل نگاہی سے جرنل کی طرف دیکھا اور کہا: "بیگم! یہ کرنل نہیں جنرل ہیں۔" اس پر مسز جانسن نے دوبارہ کہا: "معافی چاہتی ہوں، سمجھی نہیں آپ نے کیا کہا تھا؟" ادھر جرنل کی بیوی پریشانی میں پاؤں مسل رہی تھی، لیکن ان حضرات نے ایسی پاٹ دار آواز میں جو شاید سارے بھون میں سنائی دی ہو گی، اپنا مطلب واضح کیا: "مادام! میں نے یہ کہا تھا کہ لوپ امریکہ میں بھی بہت کامیاب ثابت ہوا ہے، کیونکہ اس کے استعمال کے بعد آپ کی آبادی کی شرح اضافہ میں خاصی کمی واقع ہو گئی ہے!"

جنرل کے چہرے پر فتح مندانہ وقار تھا، مگر وہ مسٹر اور مسز جانسن کے لیے مزید گفتگو ناممکن بنا چکا تھا۔ وہ دونوں فوری طور پر معذرت چاہتے ہوئے بیڈروم میں گھس گئے!!!

* * *

۱۹۶۱ کا موسم سرما راشٹرپتی بھون کے لیے بڑی مصروفیات لایا یکے بعد دیگرے کئی غیر ملکی سربراہان مملکت اور دوسرے عالی مرتبت مہمان ہماری ساری توجہ اپنی طرف مبذول کرواتے رہے۔ اس دوران میں اندرون ملک بھی بہت کچھ رونما ہو رہا تھا۔ دسمبر کے اوائل میں گوا اور اس کی متعلقہ نوآبادیوں کو پرتگال کی ساڑھے چار سو سالہ غلامی سے نجات دلوانے کے لیے فوجی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ نئی دہلی میں آرمی ہیڈکوارٹرز کے اندر حملے کا سارا پلان تیار کیا جا چکا تھا اور گوا کے قریب بلگام کے شہر میں جنوبی کمان کے ہیڈکوارٹرز کو دم بدم احکام جاری کیے جا رہے تھے۔ جنگی کارروائی کے پیش نظر دنیا بھر کے سفارتی خانوں میں ایک اضطرابی کیفیت محسوس کی جا سکتی تھی۔ وزیر اعظم کو تقریباً سبھی مغربی ملکوں سے پیغامات موصول ہو رہے تھے، جن میں انہیں فوجی مداخلت سے باز رہنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ صرف دو ماہ قبل امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ جان فاسٹر ڈلس اور پرتگالی وزیر اعظم (ڈاکٹر سلازار) کے مشترکہ بیان میں گوا وغیرہ کی حیثیت ایک پرتگالی صوبہ کے طور پر تسلیم کی گئی تھی۔

راست فوجی اقدام کے لیے ۱۵ دسمبر کی تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ سپیشل ملٹری ٹرینیں فوجیوں اور فوجی سازوسامان سے لدی گوا کی سرحدوں کی طرف جا رہی تھیں۔ راشٹرپتی بھون میں بیٹھے ہمیں یوں لگ رہا تھا، جیسے یہ سب تیاریاں گوا کی طرف سے کسی شدید حملے کے دفاع میں کی جا رہی تھیں۔ اس ساری افراتفری کا محرک جنرل کول تھا۔ ہمارے لیے یہ سب کچھ مضحکہ خیز تھا، کیونکہ سب رپورٹوں کے مطابق گوا کی فوج کی تعداد ایک بریگیڈ سے زیادہ نہیں تھی ـــــ پاکستان کے ملٹری اتاشی کرنل اقبال نے ایک دن ہمارے ایک اے ڈی سی سے طنزیہ کہا کہ جب سارے ہندوستانی فوجی گوا کی طرف مارچ کر رہے ہیں، تو وہ کس لیے پیچھے رہ گیا تھا! ـــــ ادھر مغربی سرحدوں کے پار پاکستانی فوجوں کی نقل و حرکت کی خبروں سے اور گجرات کے صوبہ میں دیو اور دامن کے ریز خیزی مقامات کے آس پاس پاکستانی طیاروں کی پروازوں سے دہلی میں خدشات پیدا ہو رہے تھے کہ شاید ہندوستانی اقدامات کو کمزور کرنے کے لیے پاکستان بھی اپنے کسی فوجی اقدام کے متعلق سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔

حملے کی تاریخ ۱۵ دسمبر کے بجائے ۱۸ دسمبر میں بدل دیا گیا، لیکن یہ راز بھی دہلی کے چند سفارت خانوں کے ذریعے راز نہ رہا۔ استخلاص کی تکمیل کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ گوا میں دارالحکومت پنجم میں پرتگالی حکومت کے گورنر جنرل کو بھی ہندوستانی حکومت کے اقدامات کی پیشگی خبریں پہنچ چکی تھیں۔ ۱۷ دسمبر کے "ایوننگ نیوز" میں اگلے دن کے "پولیس ایکشن" (جسے "آپریشن وجے" کا نام دیا گیا تھا) کے بارے میں تو خیر کوئی ذکر نہیں تھا، تاہم یہ خبر شائع ہوئی کہ پنڈت نہرو نے امریکن صدر کینیڈی ہی کے نام ایک مکتوب میں ہندوستان کے "قوت تنگ آ چکی ہونے" والے مسلسل ظلم کو مزید برداشت نہ کرنے کا ذکر کیا تھا ـــــ اس دن راشٹرپتی بھون میں کافی کھچاؤ تھا کہ ہم جانتے تھے ہماری فوجیں اب کسی لمحے بھی گوا میں داخل ہونے کو تیار ہیں۔ رات کے تقریباً ساڑھے بارہ بجے پنڈت نہرو صدر سے ملنے آئے تو اضطرابی کیفیت میں اضافہ ہو گیا۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ حقیقت میں صدر کو (جو آئینی لحاظ سے فوج کے سپریم کمانڈر بھی کہلاتے ہیں) فوجی آپریشن کے شروع ہو جانے کی اطلاع دو گھنٹے دیر سے دی گئی تھی۔

دو ایک روز بعد بھون کے ایک استقبالیے میں ایک غیر ملکی نے چبھتا ہوا سوال کیا کہ اگلے محاذوں پر جنرل کول کی موجودگی چہ معنی دارد؟ اس طرح ایک مسلم ملک کے ملٹری اتاشی نے طعنہ دیا کہ اگر وہ بٹالین کمانڈر ہوتا، تو وہ کسی جرنیل کے رینک کے سینئر افسر کو فرنٹ لائن پر اودھم مچاتے کبھی برداشت نہ کرتا! ـــــ واقعی فوجی لحاظ سے صورت حال کافی مضحکہ خیز تھی۔ کچھ اس طرح کی صورت حال ۱۹۶۲ء میں بھی پیدا کی گئی تھی، جب بریگیڈیئر دالی اس کی زد میں آ گیا۔ دالی "نیفا" کے رہنت فرنٹ ڈویژن میں والانگ سیکٹر پر گیارھویں بریگیڈ کو کمان کر رہا تھا کہ یہی جنرل کول (کور کمانڈر کی حیثیت میں) وہاں بھی فرنٹ لائن پر اپنی دوڑ بھاگ سے دالی کے کام میں شدید مداخلت کا باعث بن رہا تھا۔

گوا آپریشن سے اگر کوئی حقیقت کھل کر سامنے آئی تو وہ یہ تھی کہ نئی دہلی میں کوئی راز راز نہیں رہ سکتا تھا۔ بیشتر سفارتی حلقوں کو صرف پیش از وقت ہندوستانی ارادوں سے واقفیت ہو چکی تھی، بلکہ انہیں لمحہ بہ لمحہ کیے جانے والے اقدامات کی بھی خبریں ملتی رہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی حملے سے کافی پہلے ہمارا فوجی پلان گوا کی حکومت کے ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا۔

گوا میں مقیم پرتگیزی گورنر جنرل کی گرفتاری کے ساتھ ہی دو روزہ فوجی مشن مکمل ہو گیا۔ سترھویں ڈویژن کے کمانڈر میجر جنرل کے پی کانڈیتھ نے پرتگالی فوجوں کی جنگ بندی کی پیشکش قبول کی اور انہیں گوا، دامن اور دیو کا ملٹری ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا ـــــ صدر اور کنبہ کے چھوٹے بچوں کے لیے گوا کی شکست بڑی مسرت انگیز تھی، مگر صدر کے ملٹری سٹاف کا خیال مختلف تھا۔ ہمیں کسی فتح کا احساس نہ تھا، کیونکہ گوا اور ہماری طاقت کا کوئی مناسب موازنہ ہی نہیں کیا جا

سکتا تھا۔ یہ درست ہے کہ پرتگیزیوں کی نسبت دنیا کا کوئی اور شخص زیادہ تیزی سے ٹانگیں کس کے نہیں بھاگ سکتا۔ گوا میں ان کی فوج ساز و سامان سے عاری تھی، اور حملے کی صورت میں ان کے پاس باقاعدہ پسپائی کا بھی کوئی پلان نہیں تھا۔ اگرچہ سرحد اور دارالحکومت کے درمیان واقع چھاؤنیوں کو دفاع کرنے کی ہدایات ضرور موجود تھیں۔ پاکستانی ملٹری اتاشی کرنل اقبال کی رائے تھی کہ ان کے پاس باقاعدہ پسپائی کا کوئی پلان ہوتا، تو ایک بریگیڈ فوج بھی بھارتی حملہ آوروں کو کم از کم دس دن تک روک سکتی تھی، اور اس عرصے میں سیکیورٹی کونسل میں پرتگال یہاں جنگ بندی کروانے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔

شاید حقیقت میں یہی کچھ ہوتا۔ ہم نے سفارتی پارٹیوں میں اکثر لوگوں کو کہتے سنا کہ پنڈت نہرو کا وہ امیج (کہ وہ امن اور آشتی کے دیوتا تھے) تباہ ہو چکا تھا۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ ہندوستان اپنے کسی بھی سرحدی جھگڑے کو جنگ کے بغیر طے نہیں کروا سکا تھا، اور جب بھی ہمسایوں کی منطق نئی دہلی کے خلاف ہوئی وہ لاٹھی گولی کی منطق اختیار کر لیتا ہے۔ گوا سے پہلے کشمیر، حیدر آباد، جونا گڑھ وغیرہ کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ کچھ غیر ملکیوں نے یہ بھی پیش گوئی کی ہے کہ چین کے ساتھ جھگڑے میں بھی یہی منطق دہرائی جائے گی۔

ہم نے گوا آپریشن کے سلسلے میں غیر ضروری شور و غل سے کام لیا، حالانکہ فوجی اعتبار سے وہ ایک معمولی سی مہم تھی۔ ادھر لزبن میں ہمارا مندوب، مسٹر سی ایس جھا، اپنے ملک میں ہی ہونے والے واقعات سے بے خبر تھا۔ دراصل حکومت کی مشینری باشعور امریکیوں میں اپنے لیے حمایت کی فضا تیار کرنے میں بالکل ناکام رہی، اور انہیں اس اقدام کے بارے میں بالکل اندھیرے میں رکھا۔ واشنگٹن میں ہندوستانی سفیر نے اس صبح کو گوا میں فوجی اداروں کے بارے میں ملٹری اتاشی سے دریافت کیا، تو اسے دہلی سے کوئی ہدایت نہ تھی۔ یوں بڑی خفت کا سامان پیدا ہوا، حالانکہ ڈلس اور سلازار کے مشترکہ اعلامیہ کی روشنی میں اس سفارت خانے کو خاص طور پر تیار رکھنا بہت ضروری تھا ۔۔۔ گوا کے آپریشن میں صرف تھوڑے سے لوگ ہلاک یا زخمی ہوئے، تاہم مجھے اپنے ایک عزیز دوست میجر سہگل کی ابدی جدائی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ غیر ضروری جرأت مندی دکھاتے ہوئے مناسب حفاظتی تدابیر کے بغیر ہی گاؤں کے ایک قلعے میں جا پہنچا، اور وہاں کے کمانڈر (جو ایک کیپٹن تھا) کو ہتھیار ڈال دینے کا حکم دیا۔ اس کپتان نے نہ صرف اسے گرفتار کر لیا، بلکہ بعد میں کھڑے کھڑے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

مجھے اس وقت کا ایک اور واقعہ یاد آتا ہے۔ صدر اپنے معدے کے آپریشن کے بعد صحت کی بحالی کے مرحلے میں تھے۔ انہیں کافی آرام کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس لیے وقت گزاری کے طور پر ان کے لیے مذہبی رنگ کے ناچ گانوں اور فلموں کا انتظام کیا جاتا تھا۔ ایک روز صدر کی پرائیویٹ سیکرٹری نے اے ڈی سی نمبر ایک کو مطلع کیا کہ سہ پہر کو ساڑھے چار بجے استاد بسم اللہ خان صدر کے حضور اپنے

ہندوستان اپنا کوئی جھگڑا جنگ کے بغیر طے نہ کر سکا

فن کا مظاہرہ کریں گے۔ اے ڈی سی نے فوراً صدر کو یہ خبر سنائی، اور صدر خوش ہوئے کہ وہ ہندوستان کے چوٹی کے شہنائی نواز کے فن سے لطف اندوز ہوں گے۔ چنانچہ "اشوک ہال" کے قریب فواروں کے احاطے میں صدر کی نشست کا سامان لگایا گیا کہ اس خاص مقام پر ساز کی موسیقی کے اثرات زیادہ دلکش ہو جاتے تھے۔ سوا چار بجے تک استاد کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اے ڈی سی نے پریشانی کے عالم میں پرائیویٹ سیکرٹری کو فون کر کے پوچھا کہ کہیں پروگرام منسوخ نہ ہو گیا ہو۔ لیکن سیکرٹری نے یقین دلایا کہ شو ضرور ہو گا۔ اتنے میں ہی اے ڈی سی نے دیکھا کہ سنی کے گٹھڑے اٹھائے ہوئے کچھ سپاہیوں کا ایک گروپ چلا آ رہا ہے۔ لیکن ان کے درمیان استاد بسم اللہ خان کا کوئی نشان نہ تھا۔ گروپ کے پیچھے پیچھے ایک حضرت لنگی اور کرتے میں ملبوس آئے اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ انہیں ساڑھے چار بجے صدر کے حضور اپنا پروگرام پیش کرنے کا ٹائم دیا گیا ہے۔ ان کے نام سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جنوبی ہند سے تعلق رکھتے تھے۔ اے ڈی سی نے بڑے ذوق سے ان کے پروگرام کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ وقت تو استاد بسم اللہ خان شہنائی نواز کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس پر ان حضرت نے مسکراتے ہوئے کہا کہ وہ ابھی ابھی گارڈ روم میں بھی یہی غلط فہمی دور کر کے آ رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اصل میں انہیں "جنوبی ہند کا بسم اللہ خان" کہا جاتا ہے، اور انہی کو اس وقت پروگرام پیش کرنا تھا۔

بہر صورت صدر کو اس غلط کاری سے مطلع کرنا ضروری تھا، جس کی ذمہ دار سراسر ان کی پرائیویٹ سیکرٹری تھی، مگر وہ خاتون اپنی لاپرواہی کے لیے خاصی بدنام تھی (جب اسے صورت حال سے آگاہ کیا گیا، تو اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر بری الذمہ قرار دیا) چنانچہ سینئر اے ڈی سی نے جا کر صدر سے اس بدنظمی کی معافی چاہی۔ تاہم صدر نے کمال شفقت سے اس دوسرے "بسم اللہ خان" ہی کو سننے پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اس دوران "استاد" اور اس کی پارٹی صدر کی مسند کے سامنے ایک نصف دائرے کی شکل میں بیٹھ چکی تھی۔ صدر کو معذوروں کی کرسی میں بٹھا کر وہاں لایا گیا، اور پھر مسند پر نرم گدیلوں اور تکیوں کے سہارے بٹھا دیا گیا۔ جب صدر اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھ چکے، تو پارٹی نے بھی تعظیم کے بعد اپنی جگہ سنبھالی۔ میں نے محسوس کیا کہ چیف میوزیشن کے ہاتھوں میں شہنائی کی قسم کا جو ساز تھا (اور جسے جنوبی ہند میں "ناد اسورم" کہتے ہیں) صدر کے عین سامنے اور زیادہ قریب تھا۔ استاد نے شہنائی کو منہ سے لگا کر جو پہلی ہی سخت اور دھماکہ خیز سُر اڑایا، تو صدر ایک دم سیدھے ہو گئے۔ سُروں اور الاپ میں جوں جوں زور پیدا ہو رہا تھا، صدر مزید پیچھے کو کھسکتے جا رہے تھے۔ مجھے غیر مرئی طور پر خطرے کا احساس ہوا کہ صدر پر شدید دورہ پڑنے والا ہے۔ ادھر استاد آنکھیں بند کیے، اس صورت حال سے بے نیاز، اپنے الاپ میں زیادہ سے زیادہ جوش پیدا کرنے پر مُصر تھا۔ میں ایک دم اٹھا اور جا کر اس کے ہاتھ سے شہنائی چھین لی۔ استاد کی آنکھیں پھٹ سے کھل گئیں، اور اس نے میری اس گستاخی پر مجھے بُری طرح گھورا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اُسے سخت صدمہ پہنچا تھا، مگر میرے پاس صدر کو بچانے کے لیے اور کوئی طریقہ کار نہ تھا۔ صدر کو فوراً ان کے بیڈ روم میں پہنچایا گیا۔ ان کے ذاتی معالج دوڑتے ہوئے آئے۔ صدر نے اعتراف کیا: "میرے اے ڈی سی کی حاضر دماغی نے مجھے بچا لیا"۔ میں اپنے دفتر میں واپس پہنچا، تو "استاد" بھی وہاں آ گئے، اور مجھ سے صدر کی طرف سے خوشنودی اور پسندیدگی فن کا "سرٹیفکیٹ" دلانے کی درخواست کرنے لگے۔

ارجن ٹینا کے صدر، آرتورو فرانڈیزی نے بھی ۱۹۶۱ء کے موسم سرما میں بھارت کا سرکاری دورہ کیا، وہ چار دسمبر کو دہلی پہنچے۔ اس وقت تک ڈاکٹر پرشاد ابھی صحت یاب نہیں ہوئے تھے اور رادھا کرشنن عارضی صدر کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھے۔ ہوائی اڈے پر استقبال کی رسمیات طے ہونے کے بعد موٹروں کا جلوس کناٹ پلیس کے راستے جلوس کو روانہ ہوا، جس کار میں معزز مہمان ان کی بیگم اور ڈاکٹر رادھا کرشنن سوار تھے، اسی کار میں میں بھی ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا، جب کہ میرے برابر میں صدر فرانڈیزی کا اپنا جنرل اے ڈی سی بیٹھا تھا۔ فرانڈیزی نے ڈاکٹر رادھا کرشنن سے دریافت کیا کہ ہندوستان میں سیاسی پناہ گزینوں کے بارے میں قانون سخت تھا یا نرم۔ صدر نے بتایا ہر کیس کو علیحدہ طور پر پرکھا جاتا ہے۔

فرانڈیزی اور ان کی بیگم اچھے لوگ تھے۔ وہ ڈیوٹی پر مامور ہندوستانی اے ڈی سی سٹاف سے بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتے رہے۔ مجھے مسز فرانڈیزی سے معلوم ہوا ایک ڈیڑھ مہینے کے بعد ان کی بیٹی بھی بھارت کا دورہ کرنے والی تھی جس کا انہیں مدتوں سے اشتیاق تھا۔ انہیں امید تھی کہ اس کی ایسی ہی آؤ بھگت کی جائے گی، گویا وہ اپنے گھر میں تھی۔ مس فرانڈیزی چند ہفتوں کے بعد دہلی وارد ہوئیں اور اپنے والدین جیسی ہی پرستش کی مستحق ثابت ہوئی۔ بدقسمتی سے انہی دنوں بیونس آئرز میں حالات یکدم بگڑ گئے۔ وہاں کی نیشنل اسمبلی کے صدر نے کمانڈر انچیف کی مدد سے صدر فرانڈیزی پر مستعفی ہونے کے لیے دباؤ ڈالا! کہ ان پر اپنے ایک پیشرو (یعنی معزول صدر "پیرون") سے ہمدردی رکھنے کا الزام تھا۔ فرانڈیزی نے استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا اور رات کو ایک قومی نشریے میں اپنے آئینی صدر ہونے کا دعویٰ دہراتے ہوئے کہا کہ انہیں صرف آئینی طریقوں سے ہی ہٹایا جا سکتا تھا۔ اسی رات کو صدر کے محل سے وہ زبردستی اٹھا لیے گئے اور وہی اے ڈی سی جو ان کے ساتھ بھارت آیا تھا انہیں گرفتار کرنے پر مامور ہوا۔

صدر فرانڈیزی کو ایک جنگی جزیرے میں پہنچا دیا گیا، جہاں پہلے چار معزول صدر زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔ اس وقت فرانڈیزی

کی معزولی ہونے کی خبریں ریڈیو سے نشر ہو رہی تھیں۔ اس وقت مسز [illegible] ہمارے ساتھ بھون میں دوپہر کا کھانا کھا رہی تھی۔ خبر سنتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی —— اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے، جو وزارت خارجہ کے ایک افسر نے سنایا تھا۔ اس کے مطابق جنوبی امریکہ کے ایک ملک میں ایک بار اشتہار چھپا تھا، جس کا متن کچھ یوں تھا: ضرورت ہے ایک خوراک چکھنے والے کی۔ عمدہ تنخواہ، رہائش اور بچوں کی تعلیم مفت اور سرکاری اعزاز کے ساتھ تجہیز و تکفین!

اپنے صدارتی عہدے کے دوران ڈاکٹر پرشاد کی بڑی خواہش تھی کہ وہ امریکہ کا چکر لگائیں، لیکن ان کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ کچھ ان کی مسلسل علالت کے باعث اور کچھ سیاسی وجوہات کے باعث۔ انہوں نے ریٹائر ہونے کے بعد بھی اپنی خواہش پوری کرنے کی کوشش کی، مگر پیشتر اس کے کہ انہیں وہاں سے حتمی دعوت نامہ موصول ہو، فرشتہ اجل انہیں اپنے ملک کو لے اُڑا!

* * *

مجھے ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کی یادوں کے خزانے سے ایک شام کبھی نہیں بھول سکتی، جب انہوں نے اپنے روزمرہ کے [illegible] میں ایک ایسے دہشت پسند انقلابی کا شکایت نامہ بھی قبول کیا جو تقریباً بیس سال گرفتاری سے بچتا رہا تھا اور جسے زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کے لیے بہت بڑا انعام مقرر تھا۔

رادھا کرشنن سیاستدان نہیں تھے۔ انہوں نے تو اپنی تحریروں کے ذریعے ہندوستان کی ثقافت میں رہتے ہوئے عظیم فلاسفر کی حیثیت میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا تھا۔ وہ جنوبی ہند ہی کے ایک اور جلیل القدر فرزند یعنی چکرورتی راج گوپال اچاریہ سے کچھ مختلف تھے کہ موخر الذکر ایک عالم فاضل شخصیت ہونے کے ساتھ بہت بڑے سیاستدان بھی تھے۔ بدقسمتی سے وہ سیاست ہی کے چکر میں ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل بننے سے محروم رہ گئے —— برطانوی راج کے آخری دور میں سارا رادھا کرشنن سیاسی لحاظ سے بالکل گمنام تھے۔ ان کی حیثیت تیج بہادر سپرو اور ایم آر جیکر جیسے معمولی درجے کے سیاستدانوں جتنی بھی نہیں تھی۔ مگر ان کی شہرت ایک قابل تعظیم معلم اور قدیم ہندو فلسفے کے مفسر کے طور پر تھی۔ اس لیے وہ ہندوستانی اور غیر ملکی دانشور حلقوں میں بڑا اونچا مقام رکھتے تھے۔ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے ڈان تھے اور انہیں برطانوی شہنشاہ سے نائٹ ہڈ بھی عطا ہوئی تھی۔ آزادی کے بعد دوسرے محب وطن ہندوستانیوں کی طرح انہوں نے بھی یہ خطاب واپس کر دیا تھا۔

درحقیقت رادھا کرشنن نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ بلکہ ان دنوں وہ اپنے وطن کے سامنے سے بھی دور رہے۔ اگر ان کی ذات میں قوم پرستی کی کوئی رمق پیدا بھی ہوئی تھی تو انہوں نے اسے مخفی رکھا۔ ان کی تحریروں سے بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا کہ وہ گاندھی کی سرپرستی میں پروان چڑھنے والی تحریک آزادی کے بارے میں کیا احساسات رکھتے تھے۔ دونوں عظیم جنگوں کے درمیانی عرصہ میں انہوں نے خود کو سیاسی ہنگاموں سے بچائے رکھا اور اپنے بنیادی پیشے ہی سے کام رکھا۔ جب اُدھر گاندھی عام ہندوستانیوں کو عدم تشدد کے فلسفے کے ذریعے آزادی کا سبق سکھانے میں مصروف تھے، تو اِدھر رادھا کرشنن پڑھے لکھے لوگوں کے فائدے کے لیے قدیم شاستروں کی تفسیریں کر رہے تھے! —— ان کا بالآخر سیاست میں داخل ہونا اور دس سال تک نائب صدر رہنے کے بعد ۱۹۶۲ء میں پانچ سال کے لیے صدر کے عہدہ پر فائز ہونا دراصل نہرو کا مرہون منت تھا۔ نہرو کا عقیدہ تھا کہ آئین کے مطابق یہ دونوں عہدے سیاسی لحاظ سے غیر اہم تھے، اس لیے ان پر ایسے ہی شخص کو فائز کرنا مناسب تھا جو سیاسیات سے دور رہا ہو، مگر عقل و دانش میں یکتا ہو!

رادھا کرشنن بڑے پائے کے مقرر تھے اور سامعین کو مسحور کر دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کی تقریروں کا ایک ایک فقرہ نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ جب برطانوی وزیراعظم انتھونی ایڈن ہندوستان آئے، تو انہیں دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرنے کا اعزاز دیا گیا۔ انہوں نے بعد میں اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اعتراف کیا کہ رادھا کرشنن کے دلکش اور اعلیٰ درجے کے تعارفی خطاب کے بعد ان کا کام بیحد مشکل ہو گیا تھا کہ وہ ایوانوں کے سامنے کیا کہیں! رادھا کرشنن اس وقت راجیہ سبھا کے چیئرمین بھی تھے۔ ایڈن نے لکھا: میں نے خود کو ایسا بچہ محسوس کیا، جو ایسے کھیت میں کسی تیز رفتار خرگوش کے پیچھے ٹھوکریں کھاتا جا رہا ہو!

رادھا کرشنن ماسکو میں آزاد ہندوستان کے سب سے پہلے سفیر مقرر ہوئے تھے۔ وہ اس حیثیت میں سرکاری ضیافتوں اور تقریبات میں بھی دھوتی اور اچکن پہن کر شرکت کرنے کا ذکر ہمیشہ فخر سے کرتے رہے۔ حالانکہ جنوبی ہند کے اس لباس کو کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔ وہ عام طور پر اپنے علاقے کے معلم پیشہ افراد کی خصوصی پگڑی پہنتے تھے۔ لیکن کبھی ننگے سر بھی چلے جاتے تھے۔ وہ دعوتوں میں پیش کردہ کئی نے سے بھی احتراز کرتے رہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ کسی دعوت کے دوران ہی وہ اچانک معذرت کرکے رخصت ہو جاتے۔ روسیوں نے رفتہ رفتہ ان کے اس خلاف آداب رویہ کو قبول کرنا سیکھ لیا تھا کہ بھی دانشور ایسے ہی رویے اپنائے رکھتے ہیں! —— ایک بار میں ایک استقبالیہ کے بعد بھون واپسی پر ان کے ہمراہ تھا۔ راستہ میں انہوں نے سٹالن سے ایک ملاقات کی تفصیل بیان کی۔ وہ پہلے سفیر تھے جن کی سٹالن سے ملاقات کی درخواست منظور ہوئی۔ سوویت وزارت خارجہ کے چیف آف پروٹوکول نے کریملن میں ان کا استقبال کیا اور اس کے بعد کئی طویل برآمدوں اور راہداریوں کے گورکھ دھندے سے گزار کر سٹالن کے دفتر میں پہنچایا۔

رادھا کرشنن کے خیال میں سٹالن بڑی پرکشش شخصیت کا مالک تھا اور اس کی بڑی بڑی مونچھیں تو خاص طور پر متاثر کرتی تھیں۔ رادھا کرشنن نے جاتے ہی پہلا سوال داغا: مسٹر چیئرمین! آپ سے ملاقات کرنا اس قدر مشکل کیوں ہے؟ یہ سوال کا ترجمہ کر کے سٹالن کو سنایا گیا، تو اس نے مسکرا کر جواب دیا: مجھ سے ملاقات مشکل ہوتی تو اس وقت آپ میرے سامنے کیسے بیٹھے ہوتے! اس کے بعد کمرے کی فضا میں کچھ تناؤ کم ہو گیا اور دونوں نے کافی دیر تک سیاسی موضوعات پر تبادلہ خیال کیا۔ گفتگو کے دوران میں ایک بار ڈاکٹر رادھا کرشنن نے بڑی بے تکلفی سے سٹالن کے گھنگھریالے بالوں میں انگلی ڈال کر انہیں منتشر کر دیا! یہ ملاقات تین گھنٹے تک جاری رہی جو سٹالن سے ملاقاتوں کے سلسلہ میں ایک ریکارڈ ہے اور اس نے ماسکو اور دنیا کے دوسرے دارالحکومتوں میں سنسنی پھیلا دی تھی!

رادھا کرشنن باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ میرا خیال ہے کہ عقل و دانش میں ڈاکٹر پرشاد ان سے کم تر نہیں تھے، مگر وہ فطری طور پر کم گو اور شرمیلے تھے، جب کہ رادھا کرشنن وسیع اظہار اور کھلے عام بات کرنے کے عادی تھے۔ انہیں دلچسپ اور سحر انگیز گفتگو کرنے پر بڑی دسترس حاصل تھی۔ یہ درست ہے کہ انہیں اپنی مناسب تعریف پسند تھی۔ مگر کون ہے جو اس کمزوری کا شکار نہیں؟ دونوں صدروں کے درمیان یہ فرق تھا کہ جہاں ڈاکٹر پرشاد بقول رادھا کرشنن، دیہاتی ہندوستان کا ایک نمونہ تھے، وہاں رادھا کرشنن حباب انگیز شیمپین شراب کی مانند تھے، جسے عقل و فہم سے دو آتشہ بنا دیا گیا ہو۔ ان کا چہرہ عام مردوں کی نسبت زیادہ سرخ و سفید تھا۔ وہ اپنے لباس کی عمدگی اور صفائی پر خاص دھیان رکھتے تھے۔ ان کی اچکن اور سفید خصوصی پگڑی ہمیشہ مثال ہوا کرتی تھیں۔ اپنی ستر سالہ عمر کے لحاظ سے وہ جسمانی اور ذہنی طور پر بڑے چاک و چوبند تھے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ۱۳ مئی ۱۹۶۲ء کو ہندوستان کے دوسرے صدر کا عہدہ سنبھالا، تو سب سے پہلا سرکاری کام یہ کیا کہ اپنے پیشرو کے لیے بھارت کا سب سے بڑا شہری اعزاز "بھارت رتنا" منظور کیا۔ جسے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے بہت سراہا۔ دو دن بعد ڈاکٹر پرشاد راشٹرپتی بھون کو خیرباد کہہ کر صدر کی خصوصی ٹرین کے ذریعہ پٹنہ روانہ ہو گئے۔ نئے صدر نے انہیں پورے اعزاز کے ساتھ نئی دہلی کے پریذیڈنٹس پلیٹ فارم سے رخصت کیا۔ بلکہ ذاتی سٹاف کے کچھ ممبروں کو "صداقت آشرم" پٹنہ تک کے لیے ہمراہ کر دیا۔ جہاں پرشاد نے ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کرنے کا ارادہ کیا تھا —— پرشاد کی روانگی کے بعد انکشاف ہوا، کچھ سرکاری تحائف جو انہیں اہم غیر ملکی شخصیات سے ملے تھے، وہ بھون سے غائب تھے۔ دستور کے مطابق ایسے تحائف صدر کو ذاتی حیثیت میں نہیں، بلکہ سرکاری حیثیت میں ملتے ہیں۔ لہٰذا ان کو راشٹرپتی بھون میں سرکاری اور قومی امانت کے طور پر رہنا چاہیئے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس طرح غائب ہوئے۔ ایک افواہ تھی کہ وہ صدر کے ذاتی سٹاف کے ایک ممبر کی تحویل میں [illegible]

رادھا کرشنن تصوراتی انداز فکر میں راج گوپال اچاریہ سے [illegible] رہے تھے۔ درحقیقت سی آر ہی نے رادھا کرشنن کی سیاسی [illegible] کی تھی۔ نئے صدر کو جب بھی مدراس جانے کا اتفاق ہوا، انہوں نے وہاں ہمیشہ مسٹر آر کے گھر حاضری دی۔ اچاریہ جی نے ۱۹۶۲ء

وزیراعلیٰ صدر سے رجوع کرنے والوں کو گالیاں دیتے

ہی میں یہ توقع ظاہر کر دی تھی کہ آزادیٔ ہند اور تقسیم ہند ایک دوسرے سے منسلک تھیں اور انھوں نے گاندھی کو بھی یہ فطری امر قبول کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ ان کا پُرخلوص مشورہ ردّ کر دیا گیا، بلکہ اسی دن سے بیشتر کانگریسیوں کی نظر میں راج گوپال اچاریہ ناپسندیدہ شخصیت بن گئے۔ بعد میں جب نہرو نے راج گوپال اچاریہ کو ہندوستان کا پہلا صدر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، تو انہی لوگوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ سی آر اصولی طور پر نہرو سے بھی اختلاف رکھتے تھے، کیونکہ نہرو نے صوبوں کی نئے سرے سے لسانی بنیادوں پر تشکیل کی تھی۔ اس لیے اچاریہ جی کی نظر میں یہ اقدام قومی یک جہتی کو تباہ کرنے کی ایک کوشش تھی۔

سی آر چھوٹے قد اور بڑے سخت قسم کے انسان تھے۔ مگر دبلاپن اور عمر کی زیادتی ان کے چڑچڑے پن میں حائل نہیں ہوتے۔ رادھا کرشنن ان کے ساتھ گھنٹوں گفتگو میں مشغول رہتے ہیں — اچاریہ جی نے نہرو کی قومی اور بین الاقوامی پالیسیوں سے اختلاف کو کبھی راز میں رکھنے کی کوشش نہ کی تھی!

ایک طرف تو رادھا کرشنن کا روس میں سفارتی دور اور اس ملک کی معاشرتی اور اقتصادی ترقیوں کے بارے میں ان کے اچھے تاثرات تھے اور دوسری جانب ان کا انگلستان میں طویل قیام اور امریکہ کے بارے میں ان کی ذاتی واقفیت! ان سب نے مل کر ان تینوں ملکوں سے بھارتی تعلقات میں اچھا توازن پیدا کیا۔ بھارت کی خارجہ پالیسی کے بارے میں ان کے بیانات نہ روس کے حق میں جاتے تھے، نہ مغربی بلاک کی حمایت میں، مگر یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ مغرب کی قربت کو بھارت کی خوشحالی اور ترقی کے لیے زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔ شاید یہ انداز فکر بھی سی آر کا پروردہ تھا، کیونکہ وہ ہمیشہ برملا طور پر مغرب پسند رہے تھے

رادھا کرشنن کو یقیناً یہ احساس تھا کہ وہ بھارتی سیاست میں کوئی مقام نہیں رکھتے تھے۔ شاید اسی کمزوری کا تاثر کچھ زائل کرنے کی خاطر انھوں نے صدر کا عہدہ سنبھالتے ہی دس ہزار روپے ماہوار کی بجائے تین ہزار روپے تنخواہ لینے کا اعلان کیا۔ ان سے پیشتر صدر پرشاد اپنی دونوں میعادوں کے دوران صرف ڈھائی ہزار روپے ماہوار لیتے تھے۔ رادھا کرشنن کی بقایا تنخواہ وزیراعظم کے امدادی فنڈ میں چلی جاتی۔ انھوں نے اسی وقت یہ بھی اعلان کیا تھا کہ وہ روزانہ شام کو پانچ بجے ذاتی طور پر لوگوں سے زبانی یا تحریری شکایات وصول کیا کریں گے۔ مگر بعض سرکاری حلقے ان کی عوام الناس کے قریب آنے کی ان کوششوں کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ خود نہرو بھی کئی بار طنزیہ انداز میں پوچھ لیا کرتے تھے کہ ان کے روزانہ دربار کیسے جا رہے ہیں! جلد ہی صدر سے عوام کی ملاقاتیں روزانہ کی بجائے ہفتہ میں دو بار کر دی گئیں۔ ملاقات کے خواہش مند لوگ مشرقی یا مرکزی دالان میں جمع ہو جاتے تھے۔ ان کے بیٹھنے کی ترتیب یوں رکھی جاتی تھی کہ سب سے آگے وہ لوگ ہوتے جو فقط صدر کے درشن کرنے آتے تھے۔ ان کے بعد وہ لوگ ہوتے جو سخت بدحال تھے اور مالی امداد کے طلبگار ہوتے۔ پھر نادار طلبا تھے جو تعلیمی ترقی کے لیے وظیفہ جات وغیرہ حاصل کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ سب سے بعد میں وہ لوگ ہوتے جو کسی نہ کسی طور اپنی شکایات کا ازالہ چاہتے تھے — کبھی کبھار کوئی عورت اپنے ظالم یا بے وفا شوہر سے نجات حاصل کرنے کی درخواست بھی لے کر آجاتی؛ — کئی مجرموں کے بیوی بچے یا رشتہ دار صدر سے ان کی سزاؤں کی معافی کے درخواست گزار بھی ہوتے تھے۔

شروع شروع میں تو درخواست گزاروں کی روزانہ تعداد دو سو ہزار تک پہنچتی رہی، لیکن جب لوگوں کو احساس ہوا کہ ان درباروں میں انہیں درحقیقت کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہو سکتے تھے، تو ان کی تعداد گھٹ کر ساٹھ ستر تک رہ گئی۔ جون میں ایک اے ڈی سی کی سربراہی میں ایک کمیٹی مقرر تھی، جس کا کام درخواستوں کو وصول کرنا اور ان کی صحت کو پرکھنا ہوتا تھا۔ اس مقصد کے لیے درخواستیں صدر کے سیکرٹری کے توسط سے متعلقہ سرکاری اداروں کو بھیج دی جاتی تھیں جہاں ان پر غور و خوض میں طویل عرصہ لگ جاتا تھا۔ مگر اس طریقہ سے اس اقدام کی افادیت ہی ختم ہو کر رہ جاتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ بہت کم ایسی مثالیں ہوں گی، جن میں کسی فیصلے کی نوبت آئی ہو۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اگر کوئی فیصلہ دیا بھی گیا، تو سرکاری دفتروں کے منفی رویے کے باعث وہ درخواست گزار کے خلاف ہی گیا ہوگا۔ راشٹر پتی بھون میں دی گئی ان درخواستوں کے لیے پوسٹ آفس کا کام سنبھالنا ہی کافی نہیں تھا۔ یہ ضروری تھا کہ ان کی فوری جانچ بین اور مناسب دادرسی کا انتظام کیا جائے۔

جہاں تک طلبہ کا تعلق تھا، ان سے کچھ بہتر سلوک ہوا۔ کیونکہ ان کے معاملہ میں رادھا کرشنن اپنی ذاتی واقفیت اور وسیع رسوخ کے بل بوتے پر بہت سے وظائف اور امداد دلوانے میں کامیاب ہو جاتے تھے، جن سے وہ اندرون ملک یا بیرون ملک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے تھے — درخواستوں پر غلط یا صحیح فیصلوں سے قطع نظر ایک بات جو کھل کر سامنے آئی تھی، وہ یہ تھی کہ انتظامیہ اور عدلیہ میں بے شمار خامیوں کے علاوہ اکثر ادارتیں رشوت اور دھاندلی کو پوری طرح جائز سمجھتی تھیں۔ ہمیں پنجاب کے صوبے سے کبھی کسی کی ایک کے بعد دوسری درخواست موصول نہیں ہوتی تھی، کیونکہ وہاں کا وزیراعلیٰ، پرتاپ سنگھ کیروں، اس اعتقاد سے سلسلے کو ختم کرنے کے درپے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ درخواست دہندگان کو بلا کر ان سے ایسے نپٹ لیا کرتا تھا کہ اس کے بعد ان کی ساری شکایتیں خود بخود اور ہمیشہ کے لیے رفع ہو جاتی تھیں۔

سزا یافتہ مجرموں کے رشتہ داروں کی رحم کی اپیلیں بڑی دردناک ہوتی تھیں اور بعض دفعہ ان میں بڑے سنسنی خیز انکشافات بھی کیے جاتے تھے۔ مگر رادھا کرشنن نے ایسی درخواستوں پر از خود فیصلہ کرنے کی کچھ کوشش نہ کی۔ اگر کبھی ایسی گزارش کرنے پر مجبور ہوتا تھا، تو صدر مرکزی وزارت داخلہ کے مشورہ کو ہمیشہ اپنی خواہش پر فوقیت دیتے تھے۔ صرف ایک مثال ایسی تھی جس میں صدر نے از خود فیصلہ دیتے ہوئے مجرم کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا۔ تاہم پھانسی کے منتظر یا طویل سزائے قید پانے والوں کے بیوی بچوں کی آہ و فغاں بڑی دلدوز ہوا کرتی تھی۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب کہ مجرم اپنے کنبہ کا واحد روزی رساں ہوتا تھا۔ ایسی اپیلوں کو رد کر دینے کے بعد ڈاکٹر رادھا کرشنن کئی کئی روز تک افسردہ رہا کرتے۔ ایسی ہی ایک ناکام اپیل بحریہ کے کمانڈر ناناوتی کی تھی، جسے ۱۹۵۹ء میں بمبئی کے ایک بزنس مین کے مشہور مقدمہ قتل میں مجرم ثابت ہونے پر عمر قید کی سزا ہوئی تھی۔

٭ ٭ ٭

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے خلا میں سفر کرنے والے سب سے پہلے انسان، یوری گاگارین کو اس کے دورۂ ہند کے موقع پر خوش آمدید کہا۔ اس وقت وہ ڈاکٹر پرشاد کی علالت کے دوران عارضی صدر کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھے۔ یوری نے نمبر ۲ آزاد روڈ پر نائب صدر کی سرکاری قیام گاہ میں اپنی بیوی کے ہمراہ حاضری دی۔ یہ چھوٹے قد گٹھے ہوئے جسم والا نوجوان، جس نے بڑی پھرتی سے آگے بڑھ کر ڈاکٹر رادھا کرشنن سے مصافحہ کیا، عام ہندوستانی فوجی افسروں سے مشابہت رکھتا تھا — دنیا کے گرد اپنے تاریخ ساز خلائی سفر کے وقت یوری گاگارین کی عمر صرف ۲۷ سال تھی ———

مسز گاگارین ہندوستانی عورتوں کی طرح ایک سادہ جوڑے میں ملبوس تھی اور ایک خوبصورت گھریلو ہندوستانی عورت ہی لگتی تھی۔ ان کے ہمراہ سوویت یونین کے سفیر، سوویت ایئر اتاشی اور ایک ترجمان تھے۔ گاگارین نے صدر کو عام فہم طریقے پر اپنے خلائی سفر کے بارے میں بتایا کہ کس طرح پہلے مراحل میں وہ سفر عام ہوائی جہاز کے سفر کی طرح تھا، لیکن جب بے وزنی کی کیفیت شروع ہوئی، تو وہ بے شک ایک نرالا تجربہ تھا۔ پروگرام کے مطابق اسے خلا میں دو چکر پورے کرنا تھے، لیکن کنٹرول سٹیشن کے احکام کے مطابق وہ ایک ہی چکر کے بعد زمین پر اتر آیا۔

گاگارین نے خلائی سفر کی تکنیکی تفصیلات میں جانے سے گریز کیا۔ اس نے اپنے ذاتی مشاہدات اور تجربات کے بارے میں بھی جو کچھ بتایا وہ محض سرسری باتیں تھیں۔ مثلاً اس نے یہ نہ بتایا کہ اسے کون سے سٹیشن سے راکٹ میں اڑایا گیا تھا یا وہ کون سے سائنسدان تھے جنھوں نے اس عظیم کارنامے کو ممکن بنانے میں حصہ لیا۔ اس کے بیان کے مطابق یہ تمام منصوبہ روسی عوام کی اجتماعی کوششوں سے اور لینن کے جاودانی نظریات کے طفیل مکمل کیا جا سکا تھا — بعد میں گاگارین نے راشٹر پتی بھون میں بیمار صدر پرشاد اور ان کے کنبے سے بھی ملاقات کی۔

میری نظر میں گاگارین ایک ایسا انسان تھا جس کا نام خلائی سفر کے بانی کی حیثیت سے تاریخ میں ہمیشہ کے لیے ثبت ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ روسی قوم کا نام بھی روشن کر دیا تھا۔ چرچل نے ایک دفعہ کہا تھا: "ہم سب چھوٹے چھوٹے انسان ہیں، مگر بڑے بڑے کارنامے سرانجام دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔" اور گاگارین نے مختصر ڈیل ڈول کا انسان ہونے کے باوجود اپنے لیے دیو قد رتبہ حاصل کر لیا تھا۔ بے شک انسان کو تاریخ سازی کے لیے لمبے چوڑے جسم کی ضرورت نہیں ہوتی، صرف ان کے کارنامے ہی قابلِ ذکر ہوتے ہیں — چند سال بعد ایک مختصر سے انسان، لال بہادر شاستری نے جنہیں "چڑیا" کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا تھا، اپنے ہی انداز میں تاریخ مرتب کی۔ مجھے مسز کینیڈی کے ایک مصاحب کی بات بھی یاد آتی ہے، جس نے کہا تھا کہ خلا میں جانے والا پہلا انسان گاگارین نہیں تھا، بلکہ ایک اور روسی تھا، جس کا مردہ جسم شاید آج بھی خلا میں چکر لگا رہا ہے، کیونکہ وہ خلائی جہاز ٹیکنیکل خرابی کے باعث زمین پر واپس نہ لایا جا سکا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بدقسمت شخص مشہور روسی طیاروں کے ڈیزائنر الیوشن کا بیٹا تھا!

رادھا کرشنن کے عہدِ صدارت کی میعادوں میں بہت سے غیر ملکی سربراہانِ مملکت بھارت کے دورے پر آئے۔ ان میں روسی صدر برژنیف، شاہ لاؤس، ملائشیا کے یدقوان، یونان کے شاہ کارل، فیڈرل جرمن ریپبلک کے صدر لوبکے، یوگوسلاویہ کے صدر ٹیٹو، بلغاریہ، لبنان، میکسیکو، پولینڈ اور رومانیہ کے صدر، اور قبرص کے آرک بشپ مکاریوس شامل تھے۔ ان کے علاوہ دیگر اہم شخصیات مثلاً وزیر اعظم ملائشیا ٹنکو عبدالرحمٰن، جاپانی وزیر اعظم ایکیدا، سیلون کی مسز بندرانائکے، مصر کے ڈگ کمانڈر علی صابری، فرانس کے وزیر اعظم موسیو دیبرے، کینیڈا کے وزیر اعظم ڈیفن بیکر، ارل ٹیلی، برطانوی کامن ویلتھ سیکرٹری ڈنکن سینڈیز، اور پاکستان کے وزیر خارجہ بھٹو نے بھی بھارت کا دورہ کیا۔

برژنیف کا دورہ مجھے خاص اہمیت کا حامل معلوم ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سوویت یونین اور اس کے عوام کے متعلق میرا علم صرف ۱۹۱۷ء انقلاب کی تصاویر یا فلموں تک ہی محدود رہا تھا۔ ان تصاویر وغیرہ سے یہی تاثر ملتا تھا کہ روسی جنگجو اور سخت کوش انسان تھے یا یہ کہ انہیں سرخ رنگ سے بہت پیار تھا، لیکن برژنیف کے دورے کے بعد میرا تاثر یہ تھا کہ وہ بے حد باوقار، سنجیدہ اور تہذیب یافتہ لوگ تھے۔ برژنیف مضبوط جسم کے مالک اور بڑی پرکشش شخصیت رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کی بھویں بدصورتی کی حد تک موٹی تھیں، لیکن ان کی آنکھیں بے حد ذہین اور حسن لطافت کی مظہر تھیں —— روسی مہمانوں کا پالم کے ہوائی اڈے پر بہت گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ دونوں صدر ایک کھلی کار میں راشٹرپتی بھون کو روانہ ہوئے، اور کار میں ایستادہ، سڑکوں کے کنارے کھڑے ہوئے ہزاروں لوگوں کے والہانہ نعروں کا جواب ہاتھ ہلا ہلا کر دیتے جا رہے تھے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں رادھا کرشنن بیٹھ گئے، جبکہ برژنیف خوش رنگ کھڑے لوگوں کو دیکھتے اور خوش ہوتے رہے۔ انہوں نے ہجوم میں کھڑی ایک لڑکی کے خوبصورت چہرے کی تعریف کی اور وہاں سے گزر جانے کے بعد بھی مڑ مڑ کر اسے دیکھتے رہے، حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی —— برژنیف نے اپنی غیر معمولی آؤ بھگت کا کئی بار ذکر کیا۔

راشٹرپتی بھون میں پہنچتے ہی دونوں صدر کافی پینے کے لیے "مارننگ روم" میں چلے گئے۔ باہمی تعریف و توصیف کے ابتدائی کلمات کے بعد (ترجمان کے ذریعے) برژنیف نے کہا: "مسٹر پریذیڈنٹ! آپ روس میں سفیر رہ چکے ہیں، اور مجھے معلوم ہے —— آپ نے کہا تھا کہ آپ کو ہمارا ملک پسند ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ ہماری کئی بار کی دعوت کے باوجود آپ دوبارہ وہاں نہیں آ سکے؟" رادھا کرشنن نے معذرت کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا: "آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ روس سے واپسی کے بعد میری بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ قومی مصروفیات اور دوسری کئی اور وجوہات میری راہ میں حائل رہیں۔" مگر برژنیف مطمئن نہ ہوئے، اور انہوں نے پھر کہا: "اب تو کافی عرصہ گزر چکا ہے، اور آپ کے پاس یقیناً وقت بھی ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ہماری دعوت قبول کر کے ہمیں سرزنش نہ کرنے کا موقع دیں گے۔" ممکن ہے ترجمان روسی صدر کے الفاظ کا صحیح ترجمہ نہیں کر سکا تھا۔ تاہم رادھا کرشنن برہم نظر آئے، اور انہوں نے بھویں سکیڑتے ہوئے جواب دیا: "میں اس وقت روس جاؤں گا، جب میں صاحبِ فراش ہوں گا۔ آپ کے پاس بڑے اچھے ہسپتال ہیں۔" اس کے بعد کبھی اس موضوع پر گفتگو نہ ہوئی۔

ایئرپورٹ سے بھون جاتے ہوئے برژنیف نے امریکہ میں عدل کی ناانصافیوں پر بھی تنقید کی۔ ان کا اشارہ صاف طور پر کاریل چیس مین کی طرف تھا جسے انیس سال کی عمر میں مداخلت بیجا، زنا بالجبر اور قتل کے سنگین الزامات میں موت کی سزا دی گئی تھی، اور جو بارہ سال تک مسلسل مگر ناکام قانونی جنگ لڑتا رہا۔ (ان بارہ سالوں کے عرصے میں جیل کے اندر ہی چیس مین نے قانونی ڈگری بھی حاصل کی، اور پھر اپنا کیس خود ہی لڑا، مگر آخر کار اسے "سینگ سینگ" جیل کے گیس چیمبر میں موت کی سزا پوری کرنا ہی پڑی تھی)۔ برژنیف کی رائے میں امریکہ میں انصاف کے ادارے صحیح خطوط پر کام کرنے کی آزادی نہیں رکھتے تھے۔ رادھا کرشنن نے اس پر کہا: "میں اس سلسلے میں کچھ کہنے سے معذور ہوں، البتہ میں ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ ایک بار کسی ملک میں ایک ضلعی کمشنر نے ایک سکول کے معائنے کے دوران ایک طالب علم سے پوچھا کہ 'اناکرینینا' کس نے لکھی تھی۔ طالب علم نے ڈر کر جواب دیا کہ حضور قسم لے لیجیے جو میں نے لکھی ہو! کمشنر نے باری باری سب سے یہی سوال کیا، مگر سب طالب علموں نے کانوں پر ہاتھ دھرا۔ وہ بہت خفا ہو کر واپس چلا گیا کہ طالب علم اتنے عظیم مصنف کے بارے میں بھی نہیں جانتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر سکول کی بدنامی نہیں چاہتا تھا کہ 'ملزم' کا پتہ نہ لگ سکا۔ آخر ہفتہ عشرہ کے بعد کمشنر کو ہیڈ ماسٹر کی طرف سے ایک چٹھی ملی جس میں بتایا گیا تھا کہ انہیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ ایک بدبخت طالب علم نے آخرکار اعتراف کر ہی لیا ہے کہ 'اناکرینینا' اسی نے لکھی تھی!! مسٹر برژنیف اب آپ بتائیے کہ اگر انصاف امریکہ میں نہیں مل سکتا، تو اور کہاں صحیح طور پر دستیاب ہو سکتا ہے؟"

برژنیف کے ہمراہ سوویت ڈپٹی فارن منسٹر جیکب ملک بھی تھے جو برطانیہ کے بدنامِ زمانہ "پروفیومو سکینڈل" کے وقت لندن میں سفیر تھے۔ اس سکینڈل میں لندن میں متعین سوویت نیول اتاشی بھی ملوث تھا۔ ہم لوگ اس واقعے کے بارے میں صحیح تفصیلات جاننے کے خواہشمند تھے، لیکن مسٹر ملک نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ اس نازیبا واقعے کے بارے میں وہ کچھ کہنے سے معذور تھے۔

راشٹرپتی بھون کے ایک اور معزز مہمان لارڈ ماؤنٹ بیٹن تھے جو اپنی بیٹی پامیلا کے ہمراہ ہندوستان کے دورہ پر تھے۔ اس وقت تک مس پامیلا مسز ہکس بن چکی تھیں۔ ان کے خاوند عمارتوں کے اندرونی سجاوٹ کے ماہر تھے۔ مجھے مسز ہکس اپنے خاوند سے زیادہ عمر رسیدہ نظر آئیں۔ ویسے وہ دونوں بڑے اچھے اور خوش مزاج لوگ تھے۔ میں نے سن رکھا تھا ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے وفادار دوستوں میں شمار ہوتے تھے اور یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بھارت ابھی تک کامن ویلتھ کا ممبر تھا۔ کیمبل جانسن کی کتاب "مشن ود ماؤنٹ بیٹن" پڑھنے کے بعد مجھے اندازہ تھا کہ وہ راشٹرپتی بھون کے بارے میں کیا تاثرات رکھتے تھے جس میں وہ پہلے وائسرائے اور پھر گورنر جنرل کی حیثیت میں کافی عرصہ گزار چکے تھے۔ اس لیے مجھے اس بات پر کوئی حیرانی نہ ہوئی کہ وہ اپنے اے ڈی سی کے ہمراہ تمام کمروں میں گھوم کر ہر جگہ کے متعلق خاص خاص واقعات دہراتے رہے۔ "کیبنٹ روم" میں انہیں یاد آیا کہ گاندھی، نہرو اور لیاقت علی خان نے وہاں ایک زبردست لفظی جنگ برپا کی تھی جس کے دوران جناح اور لیاقت علی خفا ہو کر باہر چلے گئے تھے —— (ماؤنٹ بیٹن کے اس دورے کے تقریباً ایک سال بعد اسی جگہ ایک اور معاہدہ ہوا تھا جس کا ذکر بعد میں کروں گا)۔

صدر بننے کے بعد رادھا کرشنن نے نئے روسی سفارت کی ڈیوٹی کی میعاد دو سال سے بڑھا کر ڈھائی سال کر دی۔ وہ سفارت سے کنارہ کش

صدر کنیڈی نے تحفے میں دی ہوئی گھڑی واپس مانگ لی

آدمیوں جیسا سلوک کرتے تھے جس کے باعث سٹاف کے سینئر ممبروں کے درمیان کافی کشمکش پیدا ہوئی اور رشک و حسد کے بیج بوئے گئے۔ اس رسہ کشی کی ساری ذمہ داری ایک تنگ نظر لیفٹیننٹ کرنل پر تھی جس سے نہ صرف سٹاف کے اندر بگاڑ کے اسباب پیدا کیے بلکہ ان کے اور صدر کے باہمی تعلقات بھی خراب کرنے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس ڈپٹی ملٹری سیکرٹری کرنل ریڈی ایک انجینئر افسر تھا جس نے باہمی تعاون اور ہم آہنگی قائم رکھنے میں بڑی مدد دی۔ صدر کرنل ریڈی کو صرف ڈپٹی ملٹری سیکرٹری ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اُسے ایک ساتھی اور دوست کی طرح عزیز رکھتے تھے۔

ایک اور ملٹری سیکرٹری صدر کی نگاہوں میں نہ سما سکا اور نہ ہی وہ سٹاف کے دوسرے ممبروں سے ہی بنا کر رکھ سکا، مگر اس کی بیوی ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور بڑی سمارٹ خاتون تھی ہر کوئی اس کی مہمان نوازی اور اچھے اخلاق کی تعریف کرتا تھا۔ وہ بھی سٹاف کے ممبروں کو بچوں کی طرح عزیز رکھتی تھی۔ جب کوئی سٹاف ممبر اپنی بے وقوفی کے باعث مشکل میں پھنس جاتا تھا تو وہ اپنے خاوند پر اثر ڈال کر اُسے بچا لیتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم لوگ اس خاتون کو ہی ملٹری سیکرٹری گردانتے تھے۔

اس نوع کا ایک دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے جو وزیر اعظم کے سینئر ترین ڈرائیور رانا سنگھ سے تعلق رکھتا ہے۔ رانا سنگھ نہرو کے بہت منہ چڑھا ہوا تھا۔ ایک بار شراب کے نشے میں ٹیلی فون کرتے ہوئے مبینہ طور پر وہ ٹیلی فون آپریٹر لڑکی سے بدتمیزی کا مرتکب ہوا جس پر اُسے معطل کر کے انکوائری شروع کر دی گئی۔ اس دوران میں ایک اور ڈرائیور اس کی جگہ پر ڈیوٹی دینے لگ گیا۔ باقی باتوں سے قطع نظر میرا ذاتی خیال تھا کہ سارا قصہ کچھ بااثر لوگوں کی وجہ سے گھڑا گیا تھا کیونکہ وہ لوگ رانا سنگھ کی جگہ پر اپنے آدمی کو متعین کروانا چاہتے تھے۔ ان کے پاس اس کی کافی وجوہات بھی تھیں۔ دوسرا ڈرائیور انگریزی بھی اچھی طرح سمجھ بول لیتا تھا! اوپر والوں میں سے کوئی بھی بیچارے رانا سنگھ کا دفاع کرنے کو تیار نہ تھا اور انکوائری بھی ایک مذاق بن کر رہ گئی تھی۔ ایک دن رانا سنگھ میرے پاس مدد کی درخواست لے کر حاضر ہوا اور میں نے اس کا دفاع کرنے کا ارادہ کر لیا۔ کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ بورڈ آف انکوائری کی تشکیل کچھ لوگوں کے اطمینان کو مدِنظر رکھ کر کی گئی تھی اور کچھ لوگ جنہوں نے رانا سنگھ کے خلاف گواہی دی تھی، وہ خود اچھی شہرت نہیں رکھتے تھے۔ بالآخر بورڈ نے رانا سنگھ کو مجرم قرار دے دیا، مگر ایک ممبر کیپٹن بھوانی سنگھ آف جے پور نے فیصلے سے اختلاف کیا (کیپٹن بھوانی بعد میں اپنے والد کی وفات پر جولائی ۱۹۷۰ء میں جے پور کا مہاراجہ قرار دیا گیا۔ انکوائری کے وقت وہ صدر کے باڈی گارڈ میں ایڈجوٹنٹ متعین تھا) بھوانی سنگھ نے اپنا اختلافی نوٹ اس بنیاد پر دیا کہ ملٹری سیکرٹری نے وزیر اعظم کے سیکرٹری کے نام ایک خط لکھا تھا جس میں صاف طور پر رانا سنگھ کو معطل کر کے اس کے خلاف انکوائری کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

فردِ جرم عائد ہونے کے بعد کیس کی اپیل صدر تک آئی۔ صدر نے اُسے وزارتِ قانون کی طرف بھیج دیا۔ اسی دوران میں رانا سنگھ کو اشارے سے کہ وہ اگر معافی مانگ لے، تو اپنے عہدے پر بحال ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وزارت پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ بورڈ کے فیصلے کی تصدیق کرے۔ تاہم وزارتِ قانون نے بورڈ کے فیصلے کو غلط قرار دے کر صرف رانا سنگھ کو بحال کر دیا، بلکہ اسے ذہنی کوفت اور بلاجواز شرمساری کا شکار رکھے جانے پر اس کی مناسب دادرسی کا بھی حکم دیا۔ اس فیصلہ پر مجھے بے حد خوشی ہوئی، کیونکہ میں نے اس بیچارے کو انصاف کے حصول میں کچھ مدد دی تھی۔ مجھے پتہ چلا کہ اس قصے کے بعد ایک سینئر جرنیل کو ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے، اور ریٹائرمنٹ کے بعد کوئی اور ملازمت بھی نہ دی گئی۔ حالانکہ ریٹائر ہونے والے جرنیل عام طور پر کسی سفارت خانے میں کھپا دیے جاتے تھے۔

میکسیکو کے صدر ماٹیوز نے اکتوبر ۱۹۶۲ء میں ہندوستان کا دورہ کیا۔ صدر کے ہمراہ آنے والے وفد کے اراکین سبھی زندہ دل اور خوش باش تھے۔ خاص طور پر وزیر خارجہ، روبیرو، بہت یار باش قسم کا شخص تھا۔ ان لوگوں نے اس بنا پر ہندوستانی کھانے سے کوئی رغبت ظاہر نہ کی کہ اس میں ان کی پسند کے مطابق مرچیں نہیں ہوتی تھیں۔ اے ڈی سی نمبر ۲ نے کئی بار انہیں اپنے باتھ روم میں انڈے فرائی کرتے پایا۔ صورتِ حال کی اطلاع کرنل سنگھ کو پہنچا دی گئی، مگر اس نے کچھ کارروائی کرنے کے بجائے یہ جواب دیا کہ اگر انہیں ہمارا کھانا پسند نہیں تو مزے کریں ہرا کھائیں!

"ڈنر کمرے" میں حسبِ دستور کافی پینے کے دوران ہمارا تعارف میکسیکو والوں سے کروایا گیا۔ صدر ماٹیوز نے کمرے میں آویزاں آرٹ کے نمونوں کو بہت سراہا اور کہا کہ ان کو دیکھ کر واشنگٹن کے سرکاری دورے کا ایک قصہ یاد کرتا تھا۔ صدر ماٹیوز کے بیان کے مطابق مسز ماٹیوز کو صدر کینیڈی کی کلائی کی گھڑی پسند آئی اور انہوں نے اس کی تعریف میں کوئی کلمہ کہہ دیا، تو کینیڈی نے فوراً گھڑی اتار کر مسز ماٹیوز سے قبول کرنے کی درخواست کی۔ مسز ماٹیوز نے بڑی خفت محسوس کی کہ تعریف کرنے سے ان کا مطلب یہ تو نہیں تھا۔ کینیڈی بار بار اصرار کرتا رہا اور کہا کہ اس کے ملک کا دستور یہی تھا کہ مہمان جس چیز کو پسند کرے وہ اسی کا حق ہو جاتا تھا۔ صدر ماٹیوز نے بتایا کہ کینیڈی کو سبق سکھانے کی خاطر انہوں نے دعوت کے لیے موقع میں اُسے سنا کر مسز کینیڈی کی تعریف کی۔ صدر کینیڈی بات کا اشارہ سمجھ گئے۔ وہ چپکے سے مسز ماٹیوز کے پاس گئے اور ان سے اپنی گھڑی یہ کہہ کر واپس مانگ لی ہے کہ وہ بھی کبھار اپنے ملک کے رواج کو تو زیادہ بہتر سمجھتے تھے!!!

اس سال ۲۰ دسمبر کو مغربی جرمنی کے صدر لوبکے بھارت کے دورہ پر دہلی پہنچے۔ رسمی سرکاری دعوت کے بعد رادھا کرشنن نے اُنہیں ایک پرائیویٹ دعوت دی۔ مجھے ہمیشہ یہ معلوم کرنے کی خواہش رہی تھی کہ ملکوں کے سربراہ غیر رسمی ملاقاتوں میں آپس میں کیا بات چیت کرتے ہیں۔ میری خواہش پوری ہوئی — اس موقع پر صدر رادھا کرشنن نے گفتگو شروع کی: "اچھا آج کیپٹن رتہ ہمارے ساتھ ڈیوٹی پر ہیں۔" انہوں نے مسز لوبکے کے ساتھ بیٹھے ہوئے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ درست ہے مسٹر پریذیڈنٹ کہ آپ کے سٹاف پر بہت سمارٹ نوجوان آفیسر ہیں۔" اس کے بعد فوراً ہی چانسلر پرنس بسمارک (جدید جرمنی کی بنیاد رکھنے) کے سٹاف کے بارے میں بتایا۔ "ان فیلڈ مارشل وہیلم کے سب سے زیادہ سمارٹ فوجی افسروں کو چن کر اس کام کے لیے رکھا جاتا تھا۔ مگر خود صدر لوبکے کے سٹاف میں ایک بھی فوجی افسر نہیں تھا۔" اب گفتگو کا رخ مڑ کر رادھا کرشنن کی اس تقریر کی طرف ہو گیا جو انہوں نے اپنے جرمنی کے دورے کے دوران ہیمبرگ میں کی تھی اور جس میں انہوں نے کہا تھا کہ دنیا ایک بڑے ہیجان خیز دور سے گزر رہی تھی۔ مگر انہوں نے یقین ظاہر کیا تھا کہ کچھ دیر کے بعد حالات بہتر ہو جائیں گے اور دنیا ایک نئی شیرازہ بندی سے متعارف ہوگی۔ رادھا کرشنن نے اس پر کہا:

فرمودۂ اقبالؒ

نے مُہرہ باقی، نے مُہرہ بازی
جیتا ہے رومیؔ، ہارا ہے رازیؔ
روشن ہے جامِ جمشید اب تک
شاہی نہیں ہے بے شیشہ بازی
دل ہے مسلماں میرا نہ تیرا
تو بھی نمازی، میں بھی نمازی
میں جانتا ہوں انجام اس کا
جس معرکے میں مُلّا ہوں غازی
ترکی بھی شیریں، تازی بھی شیریں
حرفِ محبت، ترکی نہ تازی

میں نے ہمیشہ اپنا یہ موقف دہرایا ہے کہ قوموں کے درمیان چھوٹے چھوٹے جھگڑے اور باہمی رشک و حسد صرف اقتصادی اتحاد سے دور ہو سکتے ہیں۔ جس دن ڈیگال نے جرمنی جا کر فرانس اور جرمنی کی دوستی کا نعرہ بلند کیا تھا وہ ان دونوں قوموں کی تاریخ کا یادگار دن تھا کیونکہ عام طور پر کہا جاتا تھا کہ ان دو ہمسایوں کے درمیان جنگ کا نہ ہونا تاریخی روایات کی خلاف ورزی ہوگی! ۱۸۷۰ء، ۱۹۱۴ء اور پھر ۱۹۳۹ء کی جنگیں ان ملکوں کی تاریخ کے شرمناک باب تھے۔

صدر لوبکے نے جواب دیا: "جی ہاں! ہم جرمن لوگ پچھلی ایک صدی سے جنگ کے ہولناک اثرات کا شکار ہوتے رہے ہیں اور میں آپ سے متفق ہوں کہ اقتصادی تعاون اور اتحاد ہی ہمیں آئندہ جنگوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کوئی [illegible] مسائل میں تبدیل ہو جائے۔ وہ جھگڑوں کی ایک بنیادی وجہ تو تجارتی ہی ہوتی ہے۔" اس پر صدر رادھا کرشنن نے تائید میں کہا: "یہ بالکل درست ہے اگر ہم دوسروں کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے پرہیز کرتے رہیں تو اس سے اقتصادی اور سیاسی اتحاد میں یقیناً اضافہ ہوگا۔" ان کا اشارہ شاید کامن مارکیٹ کی طرف تھا کیونکہ صدر لوبکے نے اطمینان کا اظہار کیا: "جب انگلستان کامن مارکیٹ میں شمولیت کا فیصلہ کرے گا تو اس کے بعد اس کی توجہ کامن ویلتھ سے کچھ ہٹ جانا ایک قدرتی امر ہوگا۔" "میرا خیال ہے آخر کار کامن مارکیٹ میں شامل ہو ہی جائے گا" اور رادھا کرشنن کے اس ریمارک کے ساتھ ہی یہ گفتگو ختم ہو گئی اور سب ضیافت کے کمرے کی طرف چل دیے۔

اپریل [illegible] میں نیپال کے شاہ مہندرا کے دورہ کے دوران گفتگو میں ایک ہندوستانی افسر کے ناپسندیدہ رویہ کا قصہ اٹھایا گیا۔ ان دنوں نیپال اور چین دوستی کے بہترین دور سے گزر رہے تھے اور نیپال حکومت کے سارے اقدامات کا بنیادی مقصد چین کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔ لہٰذا ایسے اقدامات بھارت کے لیے تشویش کا باعث تھے۔ شاہ نے ضرورت اس افسر کو واپس بلا لینے کی درخواست کی۔ اس وقت وزارت خارجہ کا سیکرٹری جنرل ایم جے دیسائی بھی گفتگو میں شریک تھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ اصل میں جب بھی نیپال کی حکومت اپنے اندرونی مسائل سے پریشان ہوتی تھی تو وہ ہندوستان کو قربانی کا بکرا بنا کر جھوٹے سچے الزامات اس کے سر تھوپ دیتی تھی۔ اس پر شاہ مہندر خاموش ہو گئے۔ اس دوران میں نیپال اور بھارت کے درمیان ڈاک اور تار کے نظام کے بارے میں معاہدہ کی تجدید کا کام التوا میں پڑا ہوا تھا مگر نیپال نے اس کے برعکس چین سے کئی معاہدے طے کر لینے زیادہ مناسب سمجھا تھا جن میں سرحد کے قریب کھٹمنڈو وادی میں ایک سیمنٹ کے کارخانے کی تنصیب بھی شامل تھی۔

جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں، رادھا کرشنن پبلک میں اپنی امیج کو بہتر کرنے کے خواہش مند تھے۔ صدر بننے کے بعد انہوں نے آزادی کے ساتھ اپنے سیاسی خیالات کا اظہار شروع کر دیا تھا اور ان خیالات کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ قومی سیاست میں آزاد کردار ادا کریں۔ مگر نہرو اس پالیسی کے مخالف تھے جو ان کی اپنی پالیسی سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ چنانچہ جلد ہی ہمیں احساس ہونے لگا کہ صدر اور نہرو ایک ہی راہ کے مسافر نہیں تھے۔ دونوں کے درمیان فکری اختلاف کی خلیج بڑھ رہی تھی اور اُن کے باہمی تعلقات صرف رسمی حدود کے اندر تھے۔ نجی گفتگو کے دوران رادھا کرشنن حکومت کی کمزوری پر کڑی تنقید کرنے سے باز نہیں آتے تھے اور انہوں نے کئی بار اپنے اس انتباہ کا ذکر کیا جو انہوں نے اپنے نائب صدر کے عہد میں نہرو کو کہا تھا کہ حالات عنقریب بس سے باہر ہو جائیں گے۔ بلکہ جب وہ روس میں سفیر تھے اس وقت بھی انہوں نے ایک بار مشورہ دیا تھا کہ شیخ عبداللہ کی بے جا حمایت نہرو کو مصیبت میں مبتلا کرے گی۔ "میں نے کہا تھا کہ شیخ کو کشمیر سے ہٹا کر مرکز میں وزیر تعلیم وغیرہ لگا دو۔ حافظ محمد ابراہیم کو ریاست کا صدر مقرر کرکے موجودہ صدر یووراج کرن سنگھ کو عبداللہ کی جگہ وزیر اعلیٰ بنا دو۔ اس طرح کشمیری مسلمان ایک مسلمان صدر ریاست پا کر خوش ہوں گے جب کہ ان کا محبوب لیڈر مرکز میں وزیر ہوگا۔ مگر ریاست میں حقیقی کنٹرول ہمارے اپنے آدمی کا ہوگا۔ مگر نہرو نے میرا مشورہ رد کر دیا۔ اب نتیجہ دیکھ لو شیخ عبداللہ اس حد تک بگڑ چکا ہے کہ اب حکومت کے لیے اُسے راہ راست پر لانا ناممکن ہوگا۔" رادھا کرشنن ۱۹۴۸ء میں کشمیر کی جنگ بندی کا الزام بھی نہرو کے سر رکھتے تھے کہ وہ قومی فائدے کے بجائے دنیا کی نظروں میں اپنے وقار کا زیادہ خواہاں تھا۔

صدر اور وزیر اعظم کے باہمی روابط روز بروز کم تر ہوتے گئے۔ اگر نہرو کسی سرکاری تقریب میں دیر سے پہنچتے تو صدر ان کو احساس دلانے کے لیے خاص طور پر گھڑی کی طرف دیکھتے۔ سیاسی معاملات میں ان کے درمیان جو تھوڑی بہت مفاہمت تھی وہ بھی زائل ہو رہی تھی۔ اور جب ۱۹۶۲ء میں چین نے بھارت پر حملہ کیا تو ان دونوں کے درمیان دُوری اور زیادہ بڑھ چکی تھی۔ صدر ایک تقریب سے رخصت ہونے والے تھے اور دستور کے مطابق وزیر اعظم کو جا کر انہیں خدا حافظ کہنا تھا، مگر نہرو ہجوم میں کھوئے رہے۔ ملٹری سیکرٹری نے مجھے جا کر نہرو کو صدر کی روانگی کی اطلاع دینے کے لیے کہا چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا مگر نہرو نے ایک لمحے توقف کے بعد چڑ کر کہا: "تو میں کیا کروں؟" مگر پھر فوراً ہی مسکرا کر دونوں ہاتھ پیچھے سے میرے کندھوں پر رکھ کر چلنے کے لیے کہا اور یوں ہی چلتے ہوئے ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں صدر کھڑے تھے!

جوں جوں شمال مشرقی سرحدوں پر چینیوں کا حملہ بڑھتا گیا، صدر اور وزیر اعظم کے درمیان خلیج فراخ سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھی!

⁂

ستمبر ۱۹۶۲ء سے نارتھ ایسٹ فرنٹیر ایجنسی (نیفا) میں ہماری سرحدوں کے اندر چینیوں کی تازہ مداخلت کے بعد زرد خطرے میں اضافہ ہوتا گیا۔ چین بطور ایک قوم اس ملک کی ڈپلومیٹک چالیں، فوجی طاقت اور ہمارے خلاف ان کے ارادے روزمرہ کی گفتگو کے گرماگرم موضوع بن گئے۔ راشٹرپتی بھون میں بھی ہمارا وقت زیادہ تر یہی باتیں کرتے ہوئے گزرتا تھا۔ جب چینیوں نے ہمارے علاقے پر بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارنے شروع کیے تو کناٹ پلیس دہلی میں ہوٹل والوں نے چینی کھانوں کو بدل کر "جنوب مشرقی ایشیائی" یا "مشرق بعید کے کھانے" کے نام سے بیچنا شروع کر دیا۔ حب الوطنی کا تقاضا یہی تھا!

جب کمیونسٹوں نے ۱۹۴۹ء میں چین کے ملک پر اپنا قبضہ مضبوط کیا تو اس وقت "پیپلز آرمی" کے پاس بائیس سالہ جنگ کے بعد مختلف قسم کا نیا اور پرانا سامان حرب اکٹھا ہو چکا تھا جس میں رائفلوں سے لے کر ہوائی جہاز تک شامل تھے۔ ●●

محمد طیب کشمیری

پیروی کرنے والے اور پیروی کے خواہشمند
اس تحریر کو غور سے پڑھ لیں....

لیڈرشپ کی ۱۲ شرائط

اس پرفتن اور پُرآشوب دور میں جہاں اور بہت سے نئے نئے فتنے جنم لے رہے ہیں، وہاں ایک فتنہ قیادت کا بھی ہے۔ ہر جماعت اپنی لیڈری چمکانے اور اپنا استحقاق ثابت کرنے کے درپے ہے اور ہر شخص جو کسی جماعت اور پارٹی سے نکالا گیا ہو، دوسرے دن وہ کوئی نئی جماعت کی تشکیل دے کر اس کے سربراہ ہونے کا اعلان کر دیتا ہے۔ ہر ذی شعور اس صورتِ حال کو دیکھ کر حیران اور انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتا ہے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ حشرات الارض کی طرح جو چاہے جب چاہے مسندِ قیادت پر براجمان ہو کر عوام کو اپنی طرف مائل و متوجہ کرنے میں مصروف و مشغول ہو جاتا ہے۔ قیادت کے لیے کیا شرائط ہیں اور قائدین میں کن اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے، اس سے نہ عوام واقف اور نہ ہی خواص۔ اس لیے ضرورت اس امر کی تھی کہ قائدین کے اوصاف و خصائص عقلی اور شرعی نقطۂ نظر سے بیان کیے جائیں، تاکہ عوام ان اوصاف و خصائص کے پیشِ نظر غلط اور صحیح قیادت میں امتیاز کر کے لیڈروں کی بھرمار کو ختم کر کے امن و سکون کا سبب بنیں۔

اس ضرورت کے پیشِ نظر قائدین کے اوصاف بیان کیے جاتے ہیں۔ علماء و اجتماعیین نے قائدین کے لیے بنیادی اوصاف جو بتلائے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) تربیت (۲) صلاحیت (۳) فنائیت (۴) علمیت (۶) صبر و یقین (۷) فراست (۸) عدالت (۹) حفاظت (۱۰) دعوت و تبلیغ (۱۱) قوتِ استدلال (۱۲) اہلیت۔ اب بالترتیب ہر ایک کی تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

تربیت

قبل اس کے کہ کوئی شخص مسندِ قیادت پر اپنے لیے جگہ حاصل کرے اور دوسروں کی تربیت میں مصروف ہو جائے، ضروری ہے کہ پہلے اس کی اپنی تربیت بھی ہو چکی ہو۔ اس کی تربیت کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ جماعت کے دیگر افراد کی طرح مقتدیوں کی صف میں رہ کر دوسرے قائدین کی قیادت میں انسانی مزاج اور حالات کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرے، مزاج کے لحاظ سے بعض جذبات کو دبانے اور بعض کو بروئے کار لانے کا تجربہ حاصل کر چکا ہو، سطحیت سے ہٹ کر گہرائی پر نظر ڈالنے والا ہو، اس نے ماضی کی عظمتوں سے محض عقیدت رکھنے کے بجائے ان کے محرکات اور روح کو سمجھا ہو اور حال کی پُرفریب امیدوں میں گم ہونے کے بجائے صحیح زاویہ نگاہ متعین کرنے کا اندازہ کیا ہو، غرض اس طرح اس کی تربیت ہوئی ہو کہ ہر موڑ کو سمجھ کر صحیح راہِ عمل تلاش کر سکتا ہو۔

دوسری صورت یہ کہ کسی قائد کی قیادت تو اسے میسر نہ آئی ہو لیکن اس کی زندگی کے حالات کچھ اس قدر مختلف گزرے ہوں کہ زمانہ خود اس کا معلم بن گیا ہو، گرد و پیش کے ماحول نے غور و فکر کی نئی نئی راہیں اس کے سامنے کھول دی ہوں اور وہ انسانی مزاج اور اس کی ضرورت کو سمجھنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ خلاصہ یہ کہ قدرتی طور پر اس کی ایسی تربیت ہوئی ہو کہ ذہن و دماغ کا ایک خاص سانچہ، اخلاص و عمل کا ایک خاص نقشہ اور احوال و ظروف کا ایک خاص انداز سامنے آ گیا ہو۔

صلاحیت

قائدین میں صلاحیت ان کے کام اور مقام کی مناسبت سے ہونی چاہیے، وہ دراصل قوم کی روح اور اس کے دل کے طبیب ہوتے ہیں۔ ان کا کام مزاج اور طبیعت کی اصلاح ہے۔ ان کے لیے ایک ایسی صلاحیت درکار ہے کہ وہ مختلف انسانی مزاج اور وقت کی اہم ضروریات کو سمجھ سکیں اور تشخیص اور تجویز کے مراحل سے گزر کر باقاعدہ تربیت کے ذریعے انسان کو نیابتِ فرشی کی بجا آوری پہ لگا سکیں۔

فنائیت

فنائیت کا مطلب یہ ہے کہ قائدین جس نظریہ حیات کی قوم کو دعوت دیں وہ ان کے دل و دماغ میں اس قدر رچ بس گیا ہو کہ اب کسی اور کی گنجائش نہ ہو۔ اسی سے عشق و محبت ہو اور اسی کی نشر و اشاعت کو ہر چیز سے زیادہ محبوب رکھتے ہوں۔ نہ کسی مصیبت کی انہیں پروا ہو اور نہ کوئی توقع اور لالچ انہیں اس راہ سے ہٹا سکتی ہو۔ انبیاء کرام کی زندگی فنائیت کے بہترین نمونہ کی مثال پیش کرتی ہے، خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ ہر بڑی سے بڑی تکلیف کو برداشت کرتے ہیں اور دوسری طرف آپ سے ہر قسم کی خواہش کی تکمیل کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ لیکن آپ فرماتے ہیں:

"اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند رکھ دیا جائے، تب بھی میرے پائے ثبات کو لغزش نہ آئے گی۔"

غرضیکہ قائدین جس خیال اور نظریہ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں، ضروری ہے کہ پہلے وہ خود اس نظریہ کو اپنے دل و دماغ پر اس طرح محیط کر چکے ہوں کہ اب ان کے دماغ میں سوائے اس ایک نظریہ کے جس کی وہ اشاعت کر رہے ہیں، دوسرا کوئی نظریہ قابلِ قبول اور لائقِ تقلید نہ ہو اور اس نظریے کے خلاف باقی جتنے نظریے ہیں، وہ سب ان کو باطل اور وہم نظر آتے ہوں۔ جب تک قائد اس رتبہ کو حاصل نہیں کرتا، اس وقت تک اس میں قیادت کی صلاحیت اور اہلیت پیدا نہیں ہوتی۔

قائد اپنے اس نظریہ میں اس قدر پختہ ہو کہ باوجود موانع اور مصائب و آلام کے حائل ہونے کے وہ ہر وقت اپنے نظریہ کی اشاعت اور اپنے مقصد کی دعوت میں سرگرم رہے، دنیا کا خوف، حکومت کا ڈر، جان و مال کی محبت، اعزہ و اقارب کی ملامت غرض دنیا کی کسی مصیبت کا خیال اسے اپنے مقصد کی دعوت سے کسی وقت باز نہ رکھ سکے۔

علمیت

علمیت سے مراد یہ ہے کہ قائد جس نظریہ کی دعوت دے رہا ہے، وہ اس نظریہ حیات کے اغراض و مقاصد، معارف و مسائل [illegible] سے خود بھی واقف ہے یا نہیں۔ مثلاً پاکستان میں [illegible] آج کل ہر لیڈر، قائد اور امیدوار حلقہ اسمبلی عوام کے سامنے [illegible] کی حکومت میں قرآن و سنت پر مبنی نظام نافذ کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ اب غور یہ کرنا ہے کہ کیا یہ قائد اور لیڈر بذاتِ خود بھی اس نظامِ حیات کو جانتا ہے یا نہیں۔ قرآن حکیم نے تو ایسے لوگوں کو ان پڑھوں اور جاہلوں میں شمار کیا ہے جو قانونِ قدرت سے ناواقف اور بے خبر ہیں، ارشادِ ربانی ہے۔

ومنہم امیون لا یعلمون الکتاب [illegible] ان میں سے کچھ ان پڑھ ہیں جو کتاب کو نہیں جانتے [illegible] کہ کوئی [illegible] قیادت کے لائق نہیں، لیکن آج کا زمانہ [illegible] آئین اور دستور کے جاننے والوں [illegible] لیکن خدائی قانون کے نظامِ حیات کے جاننے والوں [illegible] بصیرت [illegible] کرنے والوں کو ان پڑھ جاہل اور غیر تعلیم یافتہ میں بے شمار کیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے اصل صورتِ حال کو وضاحت کے ساتھ سامنے رکھ کر [illegible]

ان پڑھ شخص بھی مقتدا اور رہنما کا صحیح فرق بیان کر کے عوام کو فیصلہ کرنے کے لیے آسانی پیدا کر دی ہے۔

عملیت

عملیت سے مراد یہ ہے کہ قائد نظریۂ حیات کو بروئے کار لانے کے لیے سرگرم عمل ہو جائے، یعنی یہ ہو کہ لوگوں کو اسلامی قوانین کے فوائد و ثمرات اور نفاذ کے بعد امن و سکون کا درس دیا جائے اور خود ان سے اعراض و روگردانی برتی جائے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے مشرکین کے ایک خیال کی تردید فرماتے ہوئے قیادت اور رہنمائی کے لیے دو اصول بتائے، ارشاد ہے:

اوکان اباؤھم لایعلمون شیئا ولا یھتدون (گرچہ ان کے باپ دادے دین کی نہ سمجھ رکھتے ہوں اور نہ کسی آسمانی کتاب کی ہدایت رکھتے ہوں)

اس آیت کی تفسیر میں مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہٗ اپنی شہرۂ آفاق تفسیر معارف القرآن میں لکھتے ہیں:

"غور کرنے والوں کے لیے قرآن کے اس ایک جملہ نے کسی شخص یا جماعت کی اقتداء کرنے کا ایک صحیح اصول بیان کر کے اندھوں کے لیے بینائی کا اور جاہل اور غافل کے لیے انکشاف حقیقت کا کمل سامان فراہم کر دیا ہے، وہ یہ کہ یہ بات تو معقول ہے کہ نہ جاننے والوں کو جاننا واقف لوگ واقف کاروں کی پیروی کریں، جاہل آدمی عالم کی اقتداء کرے لیکن یہ کوئی معقول بات نہیں کہ علم و عقل اور ہدایت کے معیار سے ہٹ کر اپنے باپ دادا یا کسی بھی جد کی اقتداء کو اپنا طریقہ کار بنا لیا جائے، اور بغیر یہ جانے ہوئے کہ یہ مقتدا خود کہاں جا رہا ہے اور ہمیں کہاں پہنچائے گا، اس کے پیچھے لگ لیا جائے۔"

چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

"ہر انسان پر سب سے پہلے تو یہ لازم ہے کہ وہ اپنی زندگی کا مقصد اور اپنے سفر کا رخ متعین کرے، پھر اس مقصد کو حاصل کے لیے یہ دیکھے کہ کون ایسا انسان ہے جو اس مقصد کا راستہ جاننے والا بھی ہو، اور اس راستہ پر چل بھی رہا ہو، جب کوئی ایسا انسان مل جائے تو بے شک اس کے پیچھے لگ لینا اس کو منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے یہی حقیقت ہے آئمہ مجتہدین کی تقلید کی، کہ وہ دین کو جاننے والے بھی ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی، اس لیے نہ جاننے والے ان کا اتباع کر کے دین کے مقصد یعنی اتباع خدا اور رسول حاصل کر سکتے ہیں اور جو گم کردہ راہ ہو، منزل مقصود کو خود ہی نہ جانتا ہو یا جان بوجھ کر منزل کے خلاف سمت میں چل رہا ہو اس کے پیچھے چلنا ہر عقل مند کے نزدیک اپنی سعی و عمل کو ضائع کرنا ہے، بلکہ اپنی ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔ اس علم و حکمت اور روشن خیالی کے زمانہ میں بھی افسوس ہے کہ لکھے پڑھے، ہوش مند و عقل والے لوگ بھی اس حقیقت کو نظر انداز کیے ہوئے ہیں اور آج کی بے دینی اور تباہی کا سب سے بڑا سبب نا اہل اور غلط مسند نشینوں اور لیڈروں کے پیچھے چلنا ہے۔ قرآن کریم کے اس جملہ نے اقتداء کا نہایت معقول اور واضح معیار دو چیزوں کو بنایا ہے، علم اور اقتداء۔ علم سے مراد منزل مقصود اور اس تک پہنچنے کے طریقوں کا جاننا ہے اور اقتداء سے مراد اس مقصد کی راہ پر چلنا، یعنی صحیح علم پر عمل مستقیم۔

غرض کسی کو مقتدا رہنما بنانے کے لیے علم صحیح اور عمل مستقیم کے معیار سے جانچنا ضروری ہے، محض باپ دادا ہونا یا بہت سے لوگوں کا لیڈر ہونا یا صاحب مال و دولت ہونا یا صاحب حکومت و سلطنت ہونا ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو معیار اقتدار سمجھا جائے۔"

(معارف القرآن ص ۲۴۹-۲۵۰)

صبر و یقین

قیادت اور امامت کے لیے امام اور قائد میں ان تیس اخلاقی و عملی صفات کا پایا جانا ضروری ہے، جن کا ذکر سورۃ براۃ میں "التائبون" الخ سے سورۃ مومنون میں "قد افلح المومنون" الخ سے اور سورۃ احزاب میں "ان المسلمین ..." الخ سے ہوا۔ ان تیس صفات کا خلاصہ ذیل کی آیت میں دو لفظوں میں بیان کر دیا گیا ہے ——— اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ——— اور ہم نے بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگوں کو امام و پیشوا اور مقتدا بنا دیا جو اپنے پیغمبر کے نائب ہونے کی حیثیت سے باذن ربانی لوگوں کو ہدایت کیا کرتے تھے جب کہ انہوں نے صبر کیا اور جب کہ وہ ہماری آیتوں پر یقین کرتے ہیں:

فراست

اس سے مراد مردم شناسی ہے کہ قرائن سے کھرے، کھوٹے صادق و کاذب میں تمیز کر سکے، خیرخواہ، بدخواہ، طماع، مخلص، ضامن و امین، پست ہمت و تنگ حوصلہ اور بلند ہمت اور فراخ حوصلہ میں امتیاز کر سکے اور ہر ایک کی عقل و دانائی کو اپنی فراست ایمانی کے ترازو میں تول کر معلوم کرے کہ کون آدمی کس خدمت کے لائق اور کون کس منصب کے قابل ہے۔

عدالت

عدالت کا مفہوم ان جھگڑوں کے فیصلے کا سلیقہ ہے جو بنی نوع کے درمیان وقوع پذیر ہوں، ضروری ہے کہ قائد امیر خدا شناس اور قانون عدل و انصاف کے تابع ہو، غنی و فقیر، رذیل و شریف، قریب بعید اور دوست و دشمن کی پاسداری کیے بغیر ان تمام کو عدل و انصاف کی رو سے ایک نظر سے دیکھے۔

حفاظت

مراد فسق و فجور، جور و تعدی اور مفسدین کے فساد، ملحدین اور کج رفتاروں کے سدباب کا سلیقہ و مہارت ہے، قائد و امیر کو دانشور و زیرک، صاحب حمیت اسلامی و غیرت ایمانی، خیرخواہ صالحین اور بدخواہ مفسدین ہونا چاہیے۔

دعوت و تبلیغ

اس سے مراد دین اسلام کی تبلیغ اور اس کی طرف بنی نوع آدم کو دعوت دینا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم باوجود تمام انسانیت ہونے دعوت و تبلیغ کے فرائض ادا کرنے کے پابند رہے، لہٰذا ان کے اُمتی اور خاص کر قائدین پر تو بہت ہی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ جہاں اور بہت سی باتوں اور عادات سے لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں، ضروری ہے کہ دین اسلام کے احکام و مسائل سے بھی عوام الناس کو روشناس کرائیں۔

قوت استدلال

قائدین میں ادائیگی اور بیان کی ایسی قوت ہونی چاہیے کہ اپنے خیالات کو زمانہ کی اصطلاح و زبان کے مطابق موثر انداز میں مخاطب کی طرف منتقل کر سکیں، ہر زمانے میں خیالات کی ادائیگی، طرز گفتار، اسلوب تحریر اور طریقۂ استدلال وغیرہ میں فرق ہوتا ہے، سب مخاطب بھی یکساں نہیں ہوتے اس لیے تحریر اور گفتگو کو موثر بنانے کے لیے تمام حیثیتوں کی رعایت ضروری ہے۔ موقع اور محل کے لحاظ سے اس کی چند صورتیں ہیں:

۱: کبھی حاکمانہ انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۲: کبھی حکیمانہ انداز سے کام چلتا ہے۔

۳: کبھی تاکید سے کام نکلتا ہے۔

۴: اکثر تکرار کی ضرورت پڑتی ہے۔

۵: کبھی صرف دعویٰ کافی ہوتا ہے۔

۶: کبھی دعویٰ کے ساتھ دلیل لازمی بن جاتی ہے۔ کبھی غیر شعوری طور پر دوسرے کی طرف اثر منتقل کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ بہرحال موقع اور محل کی نزاکت سے واقف ہونا ضروری ہے۔

اہلیت

شریعت نے جو اوصاف و خصائص قیادت و سیادت کے لیے مقرر کیے ہیں، اگر کسی مدعی قیادت میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں تو بلاشبہ عوام الناس کو اس کی قیادت میں جمع ہو کر منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے اور اگر اوصاف بالا سے خالی اور عاری ہونے کے باوجود پھر بھی کوئی شخص قیادت کے لیے اپنا استحقاق ثابت کرنے میں لگا ہوا ہے تو اہل ایمان کو ایسی قیادت مسترد کر کے اس شخص کو ترجیح دیں جو موجودہ لوگوں میں قابلیت، دیانت، امانت داری، علمیت اور عملیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ فائق ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ جس شخص نے کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد کیا جب کہ اس کے علم میں دوسرا آدمی اس سے زیادہ قابل اور اہل موجود تھا تو اس نے اللہ کی خیانت کی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور سب مسلمانوں کی، آج دنیائے اسلام میں جہاں بھی نظام حکومت کی ابتری نظر آتی ہے، وہ سب اس قرآنی تعلیم کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(جب دیکھو کہ کاموں کی ذمہ داری ایسے لوگوں کے سپرد کر دی گئی ہے جو اس کام کے اہل اور قابل نہیں، تو اب اس فساد کا کوئی علاج نہیں، قیامت کا انتظار کرو)

مظفر محمد علی

قدرت اللہؒ شہاب نے اعتراف کرلیا

"جنگ" کے ادبی ایڈیشن میں قدرت اللہ شہاب سے گفتگو شائع ہوئی ... اُن سے سوال کیا گیا: "لوگ کہتے ہیں، ممتاز مفتی نے قدرت اللہ شہاب کو خواہ مخواہ صوفی بنا دیا ہے؟"

شہاب صاحب کا جواب ملاحظہ ہو:

"لوگوں کا خیال بالکل درست ہے۔ تصوف کے ساتھ میرا علمی یا عملی دور کا بھی واسطہ نہیں۔ صرف زندگی کے چند سادہ سے اصول ہیں جنہیں جھوٹا سچا نبھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ جو میرے خیال میں ہر عام مسلمان کو نبھانے چاہئیں۔ ممتاز مفتی کی ملاقات میرے ساتھ اُس وقت ہوئی، جب افسروں میں غالباً اس قسم کے رجحانات زیادہ ظاہر نہیں ہوتے تھے، اس لیے وہ بڑی آسانی سے خوش فہمی کا شکار ہوگئے کیونکہ مفتی صاحب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عقیدے کو اپنا ئیں یا نہ اپنائیں، لیکن عقیدت کا روگ بڑی جلدی پال لیتے ہیں۔ میں نہایت ایمانداری سے اپنے آپ کو محض ایک عام انسان اور کمزور سا مسلمان سمجھتا ہوں۔"

ڈاکٹر وسیم اختر کراچی میں

"جسارت" کی ادبی اشاعت کے مطابق "بلند پایہ محقق اور فارسی زبان و ادب کے نوعمر عالم و ادیب ڈاکٹر اختر" ان دنوں کراچی آئے ہوئے ہیں۔ موصوف نے کم عمری میں بڑی جانفشانی کا ثبوت دیا ہے۔ ایران سے کچھ عرصہ قبل نجم ثانی پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے اور اب تاریخ میں آسٹریلیا سے پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ اس وقت ان کی تحقیق کا موضوع "سندھ میں مغل نظم سلطنت" ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے متعدد وقیع عالمانہ اور محققانہ مقالات ممتاز اور بلند پایہ علمی جرائد میں لکھے ہیں اور یہ بیک وقت فارسی، انگریزی اور اردو میں لکھتے ہیں۔ تصوف کے موضوعات سے خاص دلچسپی ہے اور کلی طور پر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ پر تحقیقی کام کیا ہے۔ جہانگیر کے عہد کا ایک تذکرہ بھی دریافت کیا ہے جو آج کل کراچی یونیورسٹی سے شائع ہو رہا ہے۔ کراچی آنے کی ایک وجہ اپنے تحقیقی مقالے کے لیے مواد کی فراہمی اور تذکرے کی اشاعت کی نگرانی ہے۔ وہ تقریباً ایک ماہ کراچی میں قیام کریں گے!

خالد احمد کا خاکہ

گلزار وفا چودھری کا "تازہ ہدف" نوجوان شاعر اور نقاد خالد احمد بنے ہیں۔ خالد کے خاکے میں سے چند اقتباسات:

"شاعروں کی نئی نسل کے سرخیل بلکہ سرغنہ ہیں۔ خوب صورت، سڈول اور ٹھوس شعر کہتے ہیں۔ بعض شعر اتنے ٹھوس ہوتے ہیں کہ کسی کند ذہن قاری کے سر میں بھی مارے جائیں، تو پاش پاش ہو جائے۔ نئی شاعری کی خوبیوں اور پرانی شاعری کی خامیوں سے کما حقہٗ آگاہ ہی نہیں کما حقہٗ بہرہ مند بھی ہیں۔ شعر کی تراش خراش شاعری کی طرح کم اور مستری کی طرح زیادہ کرتے ہیں نتیجتہً زیادہ اشعار عمدہ شاعری میں شامل ہو جاتے ہیں اور کچھ دست کاری کے عمدہ نمونوں میں۔

شاعری نثر اور گفتگو میں رعایتِ لفظی کے ایسے عادی ہیں کہ کوئی افیونی افیون کا بھی کیا ہوگا۔ اگر رعایتِ لفظی کے استعمال پر پابندی نافذ ہو جائے تو خالد احمد اس کے متاثرین کی صفِ اول میں شامل ہوں گے، اور ان کا وہی حال ہوگا جو افیون پر پابندی لگنے سے صف اوّل میں شامل افیونیوں کا ہو رہا ہے۔

قدرت نے انہیں بلا شبہ ایک خوب صورت انسان بنایا ہے لیکن انہوں نے اپنے "مستری پن" سے کام لے کر اپنے حلیے میں کچھ ترامیم (آئینی نہیں) کر رکھی ہیں کہ پہلی نظر دیکھنے پر یوں لگتا ہے، جیسے ایڈہاک بنیادوں پر انسان بنایا گیا ہو!"

اسد مفتی اور "پشاور ایکسپریس"

یہ سات آٹھ برس پیشتر کی بات ہے اسد مفتی سے ہماری پہلی ملاقات ایک فلمی ہفت روزہ کے دفتر میں ہوئی تھی۔ تب وہ شاعری کرتے تھے اور فلمی رسائل و جرائد کے لیے مضامین لکھتے تھے۔ انہی دنوں اچانک معلوم ہوا کہ وہ پاکستان سے چلے گئے ہیں۔ ایک مدت تک اُن کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ بعد میں سنا کہ وہ یورپ کے کسی ملک میں ہیں۔ پھر حال ہی میں معلوم ہوا کہ وہ اس عرصے میں فلم میکنگ کی تربیت حاصل کرتے رہے ہیں۔ پاکستان آمد کے فوراً بعد انہوں نے اپنے "فلمی پروگرام" کا اعلان کر دیا، جس کے مطابق انہوں نے اپنی ایک فلم کے لیے بھارت کے عظیم افسانہ نگار کرشن چندر کی ایک کہانی "پشاور ایکسپریس" کا انتخاب کر لیا ہے۔ یہ کہانی اتفاق سے ہماری نظر سے نہیں گزری، اس لیے ہم یہ رائے دینے سے قاصر ہیں کہ آیا اسد کو اس افسانے پر فلم بنانی چاہیے یا نہیں۔ تاہم عطاء الحق قاسمی کے ایک کالم کا اقتباس حاضر ہے جس میں اس مسئلے کا حوالہ موجود ہے۔

"ٹی ہاؤس کی ایک میز پر انتظار حسین، منیر نیازی، مظہر الاسلام اور سلیم شاہد کے علاوہ بیرونِ ملک آئے ہوئے ایک پاکستانی دوست (اسد مفتی) چائے کپ پر گپ شپ میں مصروف تھے۔ اس مہمان دوست نے ایک شریکِ محفل سے پوچھا "کیا آپ نے کرشن چندر کا افسانہ "پشاور ایکسپریس" پڑھا ہے"؟ اس شخص نے انکار میں سر ہلایا۔ پھر ہمارے دوست نے انتظار حسین سے یہی سوال کیا، تو انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ دوست نے اُن سے پوچھا "کیا یہ افسانہ نظریۂ پاکستان کے منافی ہے"؟ انتظار حسین نے کہا "آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں"؟ مہمان دوست نے جواب دیا کہ وہ اس کہانی پر فلم بنا رہے ہیں۔ اس پر انتظار حسین نے کہا کہ کرشن چندر کی فن پر دسترس اپنی جگہ، مگر وہ بہر حال ایک ہندوستانی ادیب ہیں اور قیامِ پاکستان کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر وہی ہے جو ان کے ملک کا ہے۔ آپ نظریۂ پاکستان پر ایک پاکستانی کے نقطۂ نظر سے فلم کیوں نہیں بناتے؟ ـــ ظاہر ہے کہ انتظار حسین کا یہ سوال بالکل بجا تھا، کیونکہ پاکستان میں رہتے ہوئے ہم لوگوں کو کبھی اس کا خیال نہیں آیا، ہمارے یہ دوست (اسد مفتی) تو پھر پردیسی ہیں"۔

ترقی پسند تحریک ـــ انجم رومانی کی نظر میں

"میری دانست میں اقبال کے بعد سوائے مولانا ظفر علی خاںؔ کے کسی قابلِ ذکر ادیب نے تحریکِ پاکستان میں کوئی قابلِ ذکر کردار ادا نہیں کیا۔ دراصل اس دور میں خاص طور پر ادیبوں کی بڑی برین واشنگ ہو چکی تھی۔ قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد میں ترقی پسند جمہوریوں نے ظلم کی بات بھی کی تو اشتراکیت کے حوالے سے، مسلمان کے حوالے سے کسی کو کچھ لکھنے کی توفیق نہ ہوئی، حالانکہ ڈیڑھ ماہ میں پندرہ لاکھ مسلمان اور اس کے مقابلے میں ایک لاکھ کے لگ بھگ غیر مسلم لقمۂ اجل بنے۔ اس دور میں ترقی پسند تحریک روس کے ایما پر اور علامہ اقبال کے الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس کے صدارتی خطبے کے ایک جملے کے توڑ میں شروع کی گئی تھی۔ روس کو اس وقت یہ خطرہ تھا کہ اگر برصغیر میں اسلام کے نام پر ایک ملک بن گیا، تو پھر روس کے مسلمان بھی الگ مملکت کے نام پر تحریک چلا سکتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے صدارتی خطبے میں یہ اشارہ کیا تھا کہ مجوزہ پاکستان شمال مغرب سے کسی نظریاتی اور مسلح حملے کی صورت میں برصغیر کی حفاظت کا ضامن ہوگا۔ اس پس منظر میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک چلائی گئی اور اس مقصد کے لیے خاص طور پر اردو زبان کو منتخب کیا گیا۔ میں تاریخ دانوں کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ یہ بات ثابت نہیں کر سکتے کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں اس دور میں صاحبِ فکر طبقے کو متاثر کرنے کے لیے ترقی پسند مصنفین کی طرز پر کوئی تحریک چلائی گئی۔ اس تحریک کو نہرو کی اشیر باد بھی حاصل

ہوئی تھی: (نوائے وقت کے لیے ایک انٹرویو سے اقتباس)

مختصر مختصر

• نوجوان شاعر، افسانہ نگار اور کالم نویس سعید آسی نے اپنا پہلا مجموعۂ کلام مرتب کر رکھا ہے اور ان دنوں کسی ناشر کی تلاش میں ہیں۔

• بچوں کے لیے ناہید شاہد کی شاعری کی ایک کتاب عنقریب شائع ہو رہی ہے۔

• ۲۵ مارچ کو نیشنل سنٹر لاہور میں حضرت شاہ حسین کی یاد میں ایک نشست ہوئی، جس کی صدارت ڈاکٹر وحید قریشی نے کی۔

• جناب میرزا ادیب کے صاحبزادے وقار ادیب کی شادی ۱۲ اپریل کو ہو رہی ہے۔ دعوت ولیمہ ۱۳ اپریل کو ہوگی۔

• ماہنامہ "پلک" کی قلمی معاون نگار زریں شاہد کا ناول "دل آویز" عنقریب شائع ہو رہا ہے۔

• شہباز ملک بھارت میں خواجہ نظام الدین اولیاء کے عرس میں شرکت کے بعد وطن واپس آ گئے ہیں۔

• ۴ اپریل کو نیشنل سنٹر اسلام آباد میں امجد اسلام امجد کے شعری مجموعے "ساتواں در" کی تقریب رونمائی ہو رہی ہے۔ صدارت کے فرائض شفیق الرحمٰن انجام دیں گے جب کہ ضیاء جالندھری، مجید جعفری، فتح محمد ملک، صدیق سالک، عطاء الحق قاسمی، منظر الاسلام اور محمد منشا یاد مضامین پڑھنے والوں میں شامل ہیں۔

• "نشانِ حیدر" کے حامل میجر طفیل محمد شہید کی منظوم سوانح عمری پر مشتمل حمید کوثر کی کتاب "فاتح لکشمی پور" کی تقریب رونمائی حلقۂ ادب و ثقافت راولپنڈی کے زیر اہتمام ۱۲ اپریل کو ٹاؤن کمیٹی ہال راولپنڈی میں منعقد ہو رہی ہے۔ صدارت بریگیڈیئر عطا محمد کریں گے۔

• انجمن ترقی اردو سرگودھا کی تشکیل نو کے نتیجے میں غلام جیلانی اصغر سرپرست، انگر سرحدی صدر، بشیر راہی ادیب اور محمد یوسف آزاد نائب صدر، ہارون الرشید ناظم اعلیٰ، ممتاز روحانی ناظم، محمد یونس معاون ناظم اور اویس احمد شبلی خازن منتخب ہوئے۔

• معروف نقاد اور ادیب ڈاکٹر وحید قریشی ایک بار پھر یونیورسٹی اورینٹل کالج کے شعبۂ اردو کے سربراہ مقرر کیے گئے ہیں۔

• اطہر جاوید کے "تخلیق"، نیشنل بک کونسل کے "کتاب"، نعیم صدیقی کے "سیارہ"، جان کاشمیری کے "قرطاس"، رفعت شیخ کے "ادب جہاں" اور مجلس ترقی ادب کے "صحیفہ" کے تازہ شمارے شائع ہو کر مارکیٹ میں آ چکے ہیں۔

• گزشتہ دنوں برطانیہ سے آنے والے ممتاز پاکستانی سائنس دانوں ڈاکٹر سعید اختر درانی اور ڈاکٹر وصی حسن کے اعزاز میں احمد حسن حامد کی جانب سے ایک مقامی ہوٹل میں دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی اور ڈاکٹر وصی حسن سائنس دان ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہیں۔ اس تقریب میں متعدد ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔ اس موقع پر ان شاعروں نے اپنا اپنا کلام بھی سنایا۔

• ضیاء جالندھری کی لاہور آمد کے موقع پر گزشتہ دنوں جم خانہ کلب میں ایک ادبی دعوت کا اہتمام کیا گیا جس میں احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، کنور آفتاب احمد، امجد اسلام امجد، محمد ادریس اور عطاء الحق قاسمی وغیرہ نے شرکت کی۔

• معروف شاعر اختر حسین جعفری راولپنڈی سے تبدیل ہو کر لاہور آ گئے۔ راولپنڈی میں "زندہ لوگ" کی جانب سے جلیل عالی نے ایک مقامی ہوٹل میں اُن کے اعزاز میں الوداعی تقریب کا اہتمام کیا جس میں راولپنڈی کے متعدد ادیب اور شاعر شریک ہوئے۔ بعد میں ایک مختصر شعری نشست بھی ہوئی اور اختر حسین جعفری سے اُن کی تازہ نظمیں سنی گئیں۔

• گزشتہ دنوں فیصل آباد میں حلقۂ اربابِ ذوق کے زیر اہتمام فردوس حیدر کے ناول "نقشِ قدم" کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی جس کی صدارت عزیز انجم حیدر نے کی جب کہ احسن زیدی، ملک حسن اختر، اشفاق بخاری اور یوسف عزیز نے مضامین پڑھے۔

• بزمِ اہلِ قلم ہزارہ کی جانب سے گزشتہ دنوں ایبٹ آباد میں منصور قیصر کے ساتھ ایک شام منائی گئی۔

• گزشتہ دنوں ایکسپریس فاؤنڈیشن کی جانب سے لندن یونیورسٹی کے پروفیسر کرسٹوفر شیکل کے ساتھ ایک تقریب ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں ممتاز ادیبوں نے شرکت کی۔

• بھارت کے ممتاز محقق ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی وطن واپسی سے قبل کراچی کے اربابِ قلم پاکستان کی جانب سے اُن کے اعزاز میں ۱۱ مارچ کی شام کو ایک مقامی ہوٹل میں الوداعیہ دیا گیا۔ اس تقریب میں کراچی کے بیسیوں ادیبوں نے شرکت کی۔

• ۱۰ مارچ کی رات کو کراچی کے سپورٹس کمپلیکس میں سلیم احمد کی زیر صدارت ایک نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوا جس میں تابش دہلوی، رحمان کیانی، اقبال صفی پوری، شبنم رومانی، اطہر نفیس، اعجاز رحمانی، راغب مراد آبادی، انور عزمی، شاہد لکھنوی اور دیگر شعراء شریک ہوئے۔

• ۱۱ مارچ کو حیدر آباد کے ایک ہوٹل میں امریکہ سے آنے والے پاکستانی افسانہ نگار کامل احمد کے ساتھ مجلس مصنفین حیدر آباد کی جانب سے ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا گیا۔

• عبداللہ ملک ان دنوں تیسری دنیا کے ادب کا انتخاب کر رہے ہیں۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ یہ انتخاب اپریل میں شائع ہو گا۔

• گجرات کے معروف دانشور حامد حسن سید کے تنقیدی مقالات پر مشتمل کتاب "گل ہفت رنگ" شائع ہو گئی ہے۔

• سچل سرمست کا سرائیکی دیوان پاکستان فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام شائع کر دیا گیا ہے۔ قیمت تیس روپے ہے۔

• گزشتہ دنوں ساہیوال میں ایم اے اشرف کے افسانوں کے مجموعے "نئی دنیا" کی تعارفی تقریب منعقد ہوئی۔

• ۱۷ مارچ کو غالب لائبریری کراچی میں قمری کانپوری کے شعری مجموعے "آبشارِ فکر" کی تقریب رونمائی ہوئی۔ صدارت ابواللیث صدیقی نے کی۔

• ۱۹ مارچ کو غالب لائبریری کراچی ہی میں ادارۂ یادگارِ غالب اور سر شاہ سلیمان میموریل سوسائٹی کے اشتراک سے سر شاہ سلیمان کی یاد میں تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت جسٹس ایس اے نصرت نے کی۔

• ۱۷ مارچ کو اردو کے نامور نقاد اور ماہر لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری کی برسی کی تاریخ نہایت خاموشی سے گزر گئی۔ دو ایک اخبارات نے اُن پر مضامین شائع کیے لیکن کسی بھی ادارے کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ انہیں یاد کرنے کے لیے تقریب کا اہتمام کیا جاتا۔

• عظیم ادیب عزیز احمد کی یاد میں ٹورنٹو یونیورسٹی کینیڈا کے زیر اہتمام (جہاں وہ ایک مدت سے شعبۂ معارف اسلامیہ سے وابستہ تھے) ایک یادگاری مجلے کا اہتمام کیا جا رہا ہے جس میں دنیا بھر کے بلند پایہ اور معروف دانش وروں کے مقالات شامل ہوں گے۔

• لیڈن (ہالینڈ) کے ایک جریدے "ایشین سنڈیز" نے حال ہی میں برصغیر پاک و ہند کی ترقی یافتہ زبانوں سے ہماری دلچسپی کے پیش نظر ایک خصوصی اشاعت پیش کی ہے۔ اردو کے سیاسی ناولوں کے جائزے پر مشتمل تحقیقی مقالہ علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر حبیب الرحمٰن نے لکھا ہے۔ اُن کا یہ جائزہ پریم چند کے ناول "میدانِ عمل" سے لے کر حالیہ ناولوں تک محیط ہے جس میں "ہو کے پھول" (حیات اللہ انصاری)، "شکست" (ڈاکٹر احسن فاروقی)، "اداس نسلیں" (عبداللہ حسین)، "غدار" (کرشن چندر)، "اجلا آنچل" (کرتار سنگھ دگل)، "ہاؤسنگ سوسائٹی" (قرۃ العین حیدر) اور "آگ کا دریا" (قرۃ العین حیدر) وغیرہ شامل ہیں۔

پنجابی زبان کے منفرد ڈرامہ نگار سجاد حیدر کے فن پر نامور قلمکار میرزا ادیب کا تبصرہ

پنجابی ادب

"بول مٹی دیا باویا" سے "سورج مکھی" تک

قلم، آنکھ اور روح کا سفر

دُنیائے ادب کی ہر شخصیت، قطع نظر اس امر کے کہ اُس کا ادبی قد و قامت کیا ہے، حقیقتاً ادب ہی کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔ مگر کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک خاص شخصیت ادب کی ایک خاص صنف سے اس طرح وابستہ ہو کر رہ جاتی ہے کہ اس شخصیت کا نام اور یہ صنفِ ادب لازم و ملزوم کی حیثیت لغتیاً کر لیتے ہیں۔ اب جہاں کہیں بھی ایک نام آئے گا، دُوسرا نام بھی لازماً آئے گا۔ مثال کے طور پر میں سجاد حیدر کا نام لوں گا۔ یہ نام پنجابی ڈرامے کی متاعِ گراں مایہ تصور کیا جاتا ہے۔ نتیجتہً یہ نام سجاد حیدر اور ادب کی یہ صنف جسے تمثیل نگاری کہتے ہیں، ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہیں۔ جہاں پنجابی ڈرامے کا ذکر ہوگا، سجاد حیدر کا نام زبان و قلم پر ضرور آجائے گا۔

سجاد حیدر کو ڈرامہ نگاری کا شوق کب اور کیسے پیدا ہوا، اور اس شوق کے پس منظر میں کون سے عوامل اور محرکات کارفرما تھے، اس سلسلے میں کچھ کہنا میرے لیے مشکل ہے، تاہم یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کی اوّلین کوشش جس نے اپنے اظہار کے لیے کوئی وسیلہ اختیار کیا "ہواوے ہوکے" تھا جو ۱۹۴۵ء میں آل انڈیا کے لاہور سٹیشن سے نشر ہُوا، اور جس کی شہرت جنگل کی آگ کی طرح آناً فاناً ہر طرف پھیل گئی۔

اس ڈرامے نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ یہ آل انڈیا ریڈیو کے ہر اس سٹیشن سے پیش کیا گیا، جہاں پنجابی بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ نہیں کئی کئی مرتبہ اور آج اس کی مقبولیت میں محض اس وجہ سے فرق پڑا ہے کہ اس کا مصنف اپنے پہلے نقش کے مقابلے میں بہت زیادہ خوبصورت اور دلآویز نقوش دے چکا ہے۔ بہرحال سجاد حیدر کا پہلا ڈرامہ ہی ان کے انفرادی ادبی تشخص کا ذریعہ بن گیا۔ اس کے بعد سجاد حیدر مسلسل ڈرامے لکھتے رہے، اور ۱۹۵۷ء میں ان کا پہلا مجموعہ اسی ڈرامے کے نام یعنی "ہواوے ہوکے" کے ساتھ اشاعت پذیر ہوگیا۔

اس سے پیشتر کہ میں آگے چلوں اور سجاد حیدر کے ذہنی ارتقا کے مراحل کی نشاندہی کروں، اس ماحول کا مختصر سا ذکر کرتا ہوں، جس میں انہوں نے ڈرامہ نویسی کا آغاز کیا تھا۔ یہ زمانہ تھا رواں صدی کی پانچویں دہائی کا۔ اس دَور میں جن لوگوں نے بطور ڈرامہ نویس کے کوئی امتیاز ہی تمام حاصل کیا تھا، ان میں بلونت گارگی، ترکم سنگھ کھوسلہ، کرتار سنگھ دگل اور پیرزادہ رفیع جو اس وقت رفیع پیر کہلاتے تھے، بڑے نمایاں نام تھے۔ بلونت گارگی اور ترکم سنگھ کھوسلہ کا خاص موضوع معاشرتی طنز تھا، مگر براہ راست یا حقیقت پسندانہ سطح پر نہیں، بلکہ رُومانی اسلوب کے توسط سے۔ کرتار سنگھ دگل طبعاً تھے ہی رومانی المیہ نگار۔ ان کی بیشتر دلچسپی منظوم ڈرامے سے تھی۔ خود ڈرامہ پروڈیوسر بھی تھے۔ آپ ہی لکھتے تھے، آپ ہی پیش کرتے تھے۔ دگل کی طرح بلونت گارگی اور ترکم سنگھ کھوسلہ بھی لاہور ریڈیو کے سٹاف میں شامل تھے۔ رفیع پیر نے فقط ایک مرتبہ ریڈیو سٹاف میں شمولیت اختیار کی تھی، اور یہ بھی بہت مختصر مدت کے لیے۔ وہ ریڈیو کے لیے تواتر اُردو اور پنجابی ڈرامے لکھا کرتے تھے۔ انہی ایام میں ان کا پنجابی کھیل "اکھیاں" قبولِ عام کے انتہائی نقطے پر پہنچ گیا تھا۔ آج بھی اس ڈرامے کو براڈکاسٹ کیا جائے تو سُننے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اسے بڑے شوق اور دلچسپی سے سُنے گی۔ "اکھیاں"، عشق و محبت کی ایک رومانی روداد ہے، بڑی مؤثر اور دلآویز۔ اُردو میں بھی جو ڈرامے لکھے گئے تھے، ان پر رومانی رنگ غالب تھا۔ نوجوان سجاد حیدر کا اس رنگ سے متاثر ہونا، کوئی غیر امکانی حادثہ نہ تھا، چنانچہ "ہواوے ہوکے" مصنف کے اس رومانی رویّے کا نتیجہ تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس زمانے میں ادب کی سب سے بڑی تحریک ۔۔۔ ترقی پسندی کی تحریک! سوچنے سمجھنے والے ذہنوں کو متاثر کر رہی تھی۔ میں سمجھتا ہوں سجاد حیدر نے بھی اس تحریک کا اثر قبول کیا تھا، کیونکہ اس مجموعے "ہواوے ہوکے" میں جو ڈرامے شامل ہیں ان میں سوائے ایک کے باقی تمام ڈرامے مجموعاً رومانی ہونے کے باوصف ہماری دیہی معاشرت کے بڑے بڑے مسائل اور انسانی رشتوں سے اپنا رابطہ استوار کرتے ہیں۔ ان ڈراموں میں انسانی مسائل اور انسانی رشتوں کو سمجھنے اور پرکھنے کی آرزومندی پائی جاتی ہے۔ سجاد حیدر عشق و محبت کی داستان سرائی کے ساتھ ساتھ دیہی معاشرے کی سخت گیری کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کرتے ہیں۔

"ہواوے ہوکے" سجاد حیدر کی ایک منزل ہے، مگر وُہ اسے مستقل منزل بنانے کے لیے ہرگز تیار نہیں ۔۔۔ ان کی تحریروں کی زیریں سطح پر ایک اضطراب کی لہر رواں دواں ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ آگے چلنا چاہتے ہیں، اور وُہ آگے چل رہے ہیں۔

سجاد حیدر کی دوسری منزل "سُورج مکھی" ہے، جو ان کے ڈراموں کا دُوسرا مجموعہ ہے۔ پہلے مجموعے اور اس مجموعے میں ایک واضح فرق تو یہ ہے کہ مصنف دیہی معاشرت سے نکل کر اب بڑی معاشرت میں داخل ہو گیا ہے، اور اب اس کے سامنے شہری زندگی کے پیچیدہ اور ادق مسائل پھیلے ہُوئے ہیں، اور یہ مسائل دیہی معاشرت کے مسائل سے اگر مکمل طور پر نہیں تو بہت حد تک مختلف ہیں۔ دیہی زندگی اپنے احوال کے اعتبار سے سادہ ہوتی ہے۔ اس سادہ ماحول میں جو مسائل جنم لیتے ہیں وہ پیچیدہ اور ادق نہیں ہوتے۔ یہاں ظاہر و باطن علاً یکساں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس شہری زندگی ۔۔۔ تیز رَو ہوتی ہے، جو بھی سیاسی، تہذیبی اور مجلسی تحریک اُٹھتی ہے، اُس پر فوری اثر ڈالتی ہے۔ یہاں انسان اپنے آپ کو ظاہر کم کرتا اور چھپاتا زیادہ ہے۔ اس نوعیت کے طریقِ کار سے انسانی ذہن گوناگوں کیفیات میں سے گزرتا ہے اور یوں مسائل کی ایک ایسی دلدل پیدا ہو جاتی ہے، جس پہ پاؤں رکھیں تو نیچے ہی نیچے ڈوبتے چلے جائیں۔

"سورج مکھی" کے ڈرامے پہلے مجموعے کے زمانۂ اشاعت کے بعد لکھے گئے ہیں۔ ان کا زمانۂ تحریر ۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۰ء تک ہے۔ اس مجموعے کے سارے ڈرامے شہری زندگی سے مربُوط ہیں۔ شہر کی رونق، شہر کی گہما گہمی، شہر کی ہنگامہ آرائی اور شہر کی زندگی کی تیز روی ۔۔۔ یہ سب کچھ ان ڈراموں کی فضا میں گندھا ہُوا ملتا ہے، مگر لگتا ہے جیسے ڈرامہ نگار آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اُس کی فکر پنجابی شاعری کی اُس روایت کی طرف تیزی سے اپنا رُخ پھیر رہی ہے جسے اصطلاحاً صوفیانہ

روایت کہتے ہیں۔ یہ روایت "بول مٹی دیا باویا" کی فضا پر پوری طرح چھائی ہوئی ہے۔

"سورج مکھی" اور "بول مٹی دیا باویا" کی اشاعت میں آٹھ برس کی طویل مسافت پھیلی ہوئی ہے۔ اس دوسرے مجموعے میں صرف پانچ کھیل شامل ہیں۔ آٹھ برس میں صرف پانچ ڈرامے یہ رفتار مصنف کی سست روی پر شاہد ہے، مگر سجاد حیدر "کاتا اور لے دوڑی" پر عمل پیرا نہیں ہیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد لکھتے ہیں اور ان کی تمثیلی تحریریں پڑھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کا لکھنے والا واقعات کے انتخاب، ان کی نسبت کرداروں کی تخلیق اور کرداروں کے مخصوص عمل اور باہمی گفتگو میں بڑی دقتِ نظر سے کام لیتے ہیں۔ ان کے اس پہلو کا خیال کیا جائے تو یہ مدت کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوتی، اور پھر یہ امر بھی ہے کہ ہر ایک مصنف کا اپنا اپنا طریق کار ہے۔ منٹو مرحوم نے اپنا بہت خوبصورت ڈرامہ "اس منجدھار میں" کم و بیش ایک روز میں مکمل کر لیا تھا، اور یہ بھی "سویرا" کے دفتر میں بیٹھ کر ٹریفک کے شور و غل میں۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے اس مجموعے میں پانچ ڈرامے شامل ہیں۔ پہلے ڈرامے کا عنوان ہے "میں پیچ دا مہاندرا"۔ اس ڈرامے میں مصنف نے ایک دولت مند شخص کی اس ذہنی کشمکش کی روداد علامتی رنگ میں بیان کی ہے، جس میں سے وہ گزرتا ہے۔ "سرخوش" ایک بیوپاری ہے، اس کا لہجہ کرخت ہے اور اس کی اپنی زندگی میں بھی کوئی نرمی، کوئی ملائمیت نہیں ہے۔ سرخوش کے اندر بھی ایک سرخوش چھپا ہوا ہے اور اس کی زندگی میں نرمی اور محبت ہے۔ اس ڈرامے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سرخوش کی روحانی کشمکش کو علامتی کرداروں کے ذریعے بڑی خوش اسلوبی سے واضح کیا گیا ہے۔ اس کے کردار "مودھا فقیر" "تن سن سن" بڑے پیارے کردار ہیں۔ اوّل الذکر کردار اور موخرالذکر کردار دونوں اپنی مجذوبیت اور معصومیت سے سرخوش کے ذہنی سفر میں اپنے متضاد رویے کی بنا پر اہم رول ادا کرتے ہیں۔

یہ ڈرامہ لاہور ریڈیو سٹیشن سے بھی ٹیلی کاسٹ ہوا تھا، اور گو اس کا علامتی اسلوب لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا تھا، تاہم ان کرداروں نے ناظرین کو کافی حد تک متاثر کیا تھا، جن کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ "ایضاً" سرخوش کے اندر کا آدمی ہے ـــــ سرخوش کی جیب میں قیمتی پتھر یعنی ہیرے اور جواہرات ہیں۔ اس ڈرامے کا اختتامیہ بے حد خوبصورت ہے۔ سرخوش کے اندر کا آدمی کہتا ہے۔

"میں نے تیری جیب وچوں ایہہ پتھر کڈھ لے سن۔
پر تو کا کو رولا پا دتا تے مودھے فقیر تینوں واپس دوا دتے۔
آ ہن باہر چلیئے۔"

سرخوش : (ایضاً دے نرم لہجے وچ) نہیں ایضاً آ اندر چلیئے۔

"اس باہر چلیئے" اور "اندر چلیئے" میں معنویت کی ایک دنیا آباد ہے۔ بالغ نظر مصنف نے ان دو الگ الگ فقروں سے ایک کردار کی روحانی تبدیلی کی کیفیت بیان کر دی ہے۔

دوسرے ڈرامے کا نام ہے "بول مٹی دیا باویا" ـــــ اور اسی پر ڈراموں کے اس مجموعے کا نام رکھا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں ایک گھرانہ دکھایا گیا ہے، جس کا سربراہ ہے سیٹھ بلند اقبال، اس کی بیگم کا نام ہے میڈم جی اور رومی ان کا صاحبزادہ ہے۔ اس کنبے کے یہی تین افراد ہیں ـــــ مگر ان کے گھر میں دو اور ہستیاں بھی ہیں، جن کا اس خاندان سے کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔ ان میں ایک تو ہے "ناجی" جو بقول مصنف کے اس بڑے گھرانے کی ایک بہت معمولی درجے کی نوکرانی ہے اس کی آواز میں جوانی کی ترنگ موجود ہے مگر ہے بے سر اور بے سہارا۔ دوسری ہستی ہے مٹی کا ایک "باوا" جو ناجی کی اپنی تخلیق ہے یا یوں کہیے کہ یہ ناجی کا باطنی وجود ہے۔

سیٹھ بلند اقبال اور میڈم جی بالکل ایسے ہیں جیسے انہیں ہونا چاہیئے۔ دولت کی فراوانی نے ان کے لیے آرام و آسائش کے تمام سامان مہیا کر دیے ہیں۔ دولت کی فراوانی ہو تو انسان اپنی ذہنی مصروفیت کے لیے طرح طرح کے وسیلے ڈھونڈتا ہے، چنانچہ میڈم جی کو ریکارڈوں کی فراہمی، اور انہیں سننے کا شوق ہے۔

میاں بیوی اپنی عیش پرستانہ زندگی کے گوناگوں مشاغل میں مصروف ہیں۔ انہیں ایک بے کس نوکرانی کی دلی کیفیتوں کا کیا علم! ناجی اپنے ارد گرد کسی کو اپنا ہمدرد، ہمدم اور ہم جلیس نہیں پاتی، تو وہ مٹی کے باوے ہی کو اپنا سہارا سمجھ لیتی ہے۔ اور چونکہ یہ اس کا اپنا باطنی وجود ہے وہ اس سے اپنے دل کا حال کہہ سکتی ہے، اور باوا بھی اس سے گفتگو کر سکتا ہے، مگر صرف ناجی ہی اس سے بات چیت کر سکتی ہے کوئی دوسرا نہیں، اور اس کی منطقی وجہ یہی ہے کہ باوا اس کی اپنی تخلیق ہے ـــــ اس کا اپنا باطن ہے۔ اس کے اپنے دل کی آواز کی مادی ضرورت ہے۔

رومی اس کنبے کا تیسرا فرد ہے جسے ناجی سے ہمدردی ہے، جو ناجی کا دکھ درد سمجھتا ہے اور یہ بھی سمجھتا ہے کہ اس غریب لڑکی کے ساتھ اس کے والدین بے رحمانہ اور سنگدلانہ سلوک کر رہے ہیں۔

وہ ہر موقعے پر ناجی کے ساتھ رہتا ہے۔ ناجی اسے اپنا سچا ہمدرد پا کر اس کے لیے اپنے دل کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ اب اس کی ساری امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز رومی ہے، مگر آخر رومی بھی تو اسی منافقت پرور ماحول کا پروردہ ہے، جس میں دل زبان کے ساتھ ہم آہنگ نہیں تھا یا جو آزمائش کی پہلی ہی آنچ سے پگھل جاتا ہے۔ رومی بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے، اور ماں کے لیے نئے ریکارڈ نکلوانے کی خاطر چلا جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد ناجی اپنے ہمدم مٹی کے باوے کی طرف متوجہ ہوتی ہے، اور کہتی ہے:

ناجی : (اپنے آپ نال) صاحب جی دیاں گلاں۔ کیہ انسان تے جانوراں توں وی بے زبان ہوندے نیں (زہر خند) وے باویا! کوئی گل کر، (ہی دخاموشی) باویا ایہ جے ہن نہ بولیوں تے میں تینوں بھن دیاں گی۔ (منت نال) بول باویا!

(مٹی دا کھڈونا ہن دی آواز۔ ناجی سسکیاں لیندی اے)

ہن تے اندروں وی جواب نہیں آندا۔ ہن کیہ بنے گا۔ ہائے اللہ ہن میرا کیہ بنے گا؟

یہاں پر ڈرامہ اپنے قارئین پر ایک بہت گہرا تاثر چھوڑ کر ختم ہو جاتا ہے۔ ناجی کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اب اس کا باطنی وجود بھی اس سے الگ ہو جاتا ہے۔ کیا اب وہ مایوسیوں کے اتھاہ اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتی رہے گی؟ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے، لیکن سجاد حیدر امیدوں اور روشنیوں کا پیغامبر ہے۔ وہ ایک انسان کو اس طرح بے آسرا اور بے سہارا نہیں چھوڑ سکتا۔

اگر ناجی نے پہلے ایک سہارا ڈھونڈ لیا تھا، تو بعد میں بھی کوئی نہ کوئی سہارا ڈھونڈ سکتی ہے ـــــ خیر یہ الگ مسئلہ ہے مجھے یہاں یہ کہنا ہے کہ "بول مٹی دیا باویا" ہمارے منافق طبقے پر ایک بہت بڑی طنز ہے۔ ہمارا ظاہر باطن ایک جیسا نہیں ہے۔ ہماری ہمدردیاں پلے ہوئے لوگوں کے ساتھ محض عارضی ہوتی ہیں۔ رومی زبان سے تو ناجی کو بڑی امیدیں دلاتا ہے، لیکن ساتھ اس کا نہیں اپنی ماں کا دیتا ہے۔ اس ماں کا جو فیشن ایبل ہے، دولت مند ہے جو اسے زندگی کی ساری سہولتیں دے سکتی ہے۔

رومی کا کردار ایک طبقے کا کردار ہے۔ وہ اس طبقے کا نمائندہ ہونے کے ناطے اس کا کرداری تضاد واضح کر دیتا ہے۔

اس ڈرامے کا نام "بول مٹی دیا باویا" ہے۔ "صرف مٹی دا باوا" بھی نام ہو سکتا تھا اور اگر مصنف یہ نام رکھ دیتا، تو قارئین کی ایک اچھی خاصی تعداد کو اس پر مطلقاً اعتراض نہ ہوتا، مگر میں سمجھتا ہوں جو فن کارانہ نزاکتِ خیال "بول مٹی دیا باویا" میں ہے، "صرف مٹی دا باوا" میں قطعی طور پر نہیں۔ "بول مٹی دیا باویا" میں مخاطبت ایک تو ناجی اور باوے کے باہمی تعلق میں بے تکلفی کا رنگ ابھارتی ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ اس سے ناجی کی جذباتی شدت کا بھی احساس ہوتا ہے۔

حضرت عیسیٰ نے کہا تھا :

DUST SHOU ART AND DUST
THOUWILL BE

مٹی سے ہمارا خمیر گوندھا گیا ہے۔ انسان مٹی سے اٹھتا ہے اور آخر مٹی میں مل جاتا ہے۔

یہ مٹی کا باوا حقیقتاً استعارہ ہے آدمیت کا۔ ناجی کا مٹی کے باوے کو مخاطب کرنا انسانوں کے اس جنگل میں آدمیت کو مخاطب کر کے اس کا سہارا ڈھونڈنے کی علامت ہے۔

اس سے پیشتر کہ میں آگے چلوں، یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سجاد حیدر نام رکھنے میں بڑی گہری سوجھ بوجھ کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کی نثر نگاری کے متعلق آخر میں کچھ کہہ سکوں گا، یہاں صرف ان کی حسِ لطیف کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو ان کے ڈراموں کے عنوانات کے انتخاب میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ ان کے ہر ڈرامے کے عنوان میں خیال افروزی تو ہوتی ہی ہے، ایک خاص قسم کا ترنم بھی ہوتا ہے ـــــ ایک ایسی نغمگی جو بہتی ہوئی ندی کی مدھر لہروں میں ہو!

"میرا ڈرامہ گھگھو گھوڑے ہے"۔

ایک زمانے میں نوجوان لڑکے اور خوبصورت دوشیزائیں منڈی میں فروخت ہوتی تھیں۔ سجاد حیدر نے اس پرانی مکروہ رسم کو موجودہ زمانے کے معاشرے پر منطبق کرکے انسان پر ظلم دکھایا ہے۔

اس ڈرامے کا ابتدائیہ اتنا خوبصورت ہے کہ میں اس کا ایک مختصر حصہ پیش کرنے پر مجبور ہوں۔ غلاموں کی منڈی لگی ہے۔ سوداگر اپنی سریلی آواز میں کہہ رہا ہے۔

دو آبے دیو لوکو!
شہ سوداگر آیا
جاگاں ڈُبے سُتے کرو
دن خیسیں آیا
دانہ مہنس دا جوڑا
میں دکری لایا
لوکھیو دکھ جوان دی
انگ انگ ستایا
دیہہ ساوُ ساہن سلکھنا
راٹھاں دا جایا
علوں سترلوڑے ایڈا
تے روپ سوایا

گھیر کر سوداگر کہتا ہے :

لے مُکا راوی پار دا
جھُلیں پہ آیا
سلادی شوہجادہ صگّل
جیت پھیرا آیا
ہوا اُڈیان دی سرخات لے
ورہادی مایا
کس کنی دا بولا ویکھیے
ایہہ پٹن آیا

سوداگر جب بولی دیتا ہے، تو خریدار بتائی ہوئی قیمت پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس پر وہ کہتا ہے :

سوداگر : ہرکسے دا کم نہیں مہربان ! ایہہ اشرافاں دا سودا اے۔ راتھڑ روز روز وکن نہیں آوندے۔

ملاحظہ فرمایئے لے گندے اور انسانیت سوز کاروبار میں "اشرافاں" کا ذکر کیا جانا ہے، کتنی بڑی اور گہری طنز ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے یہ ڈرامہ انسان کے انسان پر ظلم و ستم کی روداد بیان کرتا ہے۔

اس کا اگلا ڈرامہ "پنجرہ" ہے۔ اس کے متعلق تفصیلاً عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔ سب سے پہلے اس کا پلاٹ انتہائی اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ راؤ آدم خان اپنے وقت کا ایک بڑے رعب داب والا آدمی ہے، اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ اعزازِ خسروی کے لیے دوسروں پر ظلم کرنا اس کے نزدیک بہت معمولی معاملہ ہے، مگر جیسا کہ کہا گیا ہے۔ ہر فرعونے را موسیٰ ــــ اس کا دشمن ایک نواب جنگ میں اسے شکست دے دیتا ہے۔ یہ شکست اسے ایک سازش کے تحت ملتی ہے، تاہم اب وہ پا بجولاں اپنے فاتح کے سامنے حاضر ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور فاتح اس کی تذلیل کے لیے ایک بڑے پنجرے میں اسے بند کر دیتا ہے۔

اپنے مفتوح کو پنجرے میں بند کرنے کی ذلت آمیز منتقمانہ کاروائی پہلے بھی ہوتی رہی، چنانچہ سولہویں صدی کے جواں مرگ انگریزی ڈرامہ نگار اور ولیم شیکسپیئر کے ہم عصر کرسٹوفر مارلو نے اپنے ڈرامے ــــ

"TAM BURLAIN THE GREAT"

میں امیر تیمور کے حکم پر اس کے مفتوح ترک حکمران بایزید یلدرم کو ایک پنجرے کے اندر قیدی دکھایا ہے، جہاں تک تاریخی صحت کا تعلق ہے، اس واقعے کی حیثیت کیا ہے ــــ اس وقت مجھے اس سے غرض نہیں۔ کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ تہذیب و تحقیر کا یہ حربہ اپنی نوعیت کا نیا حربہ نہیں ہے، مگر سجاد حیدر اسے موجودہ دور میں عوامی سطح پر لے آئے ہیں۔ مارلو کے ڈرامے میں صرف تیمور اپنے مفتوح کو ہر طرح تختۂ تضحیک بناتا ہے، مگر یہاں راؤ آدم خان سے انتقام وہ عام لوگ لیتے ہیں، جن پر وہ اپنے دورِ اقتدار میں ظلم و ستم کرتا رہا ہے۔ مثلاً "پاسا جوہری" ہے جس کے بنائے ہوئے زیورات پر وہ زبردستی قبضہ کر لیتا ہے اور وہ چیختا چلاتا ہے، تو اسے دھکے دے کر پرے پھینک دیتا ہے، اور وہ اب آیا ہے اپنا انتقام لینے۔ اسی طرح "سوزشاہی خان" ہے جو راؤ آدم خان کی فوج کا ایک سپاہی تھا، اور جو لوٹ مار میں ایک عورت کے زیورات لوٹ لیتا ہے، مگر آدم خان اس سے یہ زیورات زبردستی چھین لیتا ہے۔ "رشنائی" بھی آدم خان کی ستم رسیدہ ہے۔ اس عورت کو آدم خاں کے سپاہی گرفتار کرکے محل میں پہنچا دیتے ہیں، اور اس کے عاشق کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ وہ بھی انتقام لینے کے لیے آ پہنچی ہے۔

ایک بزرگ "سخی مولا" بھی وہاں آ جاتا ہے۔ اس کا کردار انتقام لینے والوں سے بالکل مختلف ہے۔ وہ آدم خان کو پانی پلاتا ہے۔ یہ منظر مجھے وکٹر ہیوگو کے ناول (THE HUNCH BACK OF NOTREDAM) کے اس منظر کی یاد دلاتا ہے جس میں ایک خانہ بدوش دوشیزہ سارے تماشائیوں کے برعکس مظلوم کبڑے کو پانی پلاتی ہے) اس وقت پنجرے کے اردگرد جو لوگ جمع ہیں وہ آدم خان پر قہقہے لگا رہے ہیں اور اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان سے مخاطب ہو کر سخی مولا جو کچھ کہتا ہے وہ اعلیٰ درجے کی شاعری سے ہم آہنگ ہے۔ یہ نثر پارہ طویل ہے، مگر اس قدر موثر ہے کہ میں اسے نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ آگے چل کر مجھے سجاد حیدر کی نثر نگاری پر جو کچھ عرض کرنا ہے اس لیے یہی مثال دینا ہوگی۔

"سخی مولا (خطابت دے انداز وچ) بچے دلی ہلے۔ بڑا گند دیا لے۔ تماشا ویکھن آئے او میرے وچوں ! بندہ پنجرے پیا کدی نہیں ویکھیا گھروں نکل آئے او۔ ہے ایہہ بے نصیب کیہڑا پھیر دا پنجرے وچ بند اے۔ کدی اپنے اندروں جھات پائی جے ؟ ایہہ تماشا تے تواڈے اندر لگا پیا اے۔ اسیں سارے پنجریاں وچ بند آں۔ تے اپنے پنجرے نال چکی پھرنے آں۔ ایس پنجرے دیاں تیلیاں اساں آپ گھڑ گھڑ بنایاں نیں۔ حرص دی تیلی، مکر دی تیلی، غصے دی تیلی، نفرت دی تیلی، ہوس دی تیلی، ظلم دی تیلی۔ ایہناں تیلیاں دا پنجرہ بنا کے اسیں آپ وچ ہو بیٹھے آں۔ راؤ آدم ساڈوں پنجرے وچ پھاتھا دسدا اے۔ آپنا پنجرہ ساڈوں نئیں دسدا۔ میرے بھائیو ! آپنے اندر جھاتی پاؤ۔ اندر دے جالے لاہو۔ آپنیاں پنجریاں دیاں تیلیاں بھنو۔ انہاں پنجریاں توں باہر نکلو۔ ایس وچارے قسمت دے مارے دا پنجرہ تے اوڑک کھُل ای جائے گا۔ پر اسیں جس پنجرے وچ پھاتھے آں اوہدا بوہا کوئی ہور نئیں کھول سکدا۔ اوہ اساں آپے کھولنا اے۔ دل دا زور لاؤ تے بوہا کھولو۔ باہر آؤ تے آزادی دا ساہ لو (راؤ نوں) کیوں سجناں پانی پئیں گا ؟

یہ اقتباس طویل ہے، مگر سخی مولا کا کردار سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

میں نے یہ اقتباس ایک اور وجہ سے بھی دیا ہے۔ ان سطروں کا ایک ایک حرف مصنف کے دل سے نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے، میں یہ عرض کروں کہ سجاد حیدر پنجابی زبان کی کلاسیکی روایات کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھتے چلے گئے ہیں، اور اب تو ان کے تصورات انہی روایات کی فضا میں پھیل رہے ہیں، اور آگے بڑھ رہے ہیں یوں سخی مولا کا کردار مصنف کا وہ کردار ہے جو تصوف میں سانس لے رہی ہے، اور جس سے مصنف کو بڑی عقیدت ہے۔

اس ڈرامے میں ایک اور بہت پیارا کردار بھی ہے اور یہ ہے "مائی میراں" راؤ آدم نے اگر کسی پر سب سے بڑا ظلم کیا ہے، تو وہ یہ عورت ہے جس کے اکلوتے بیٹے کو اس نے محض اس وجہ سے مروا دیا تھا کہ اس نے عالم جنوں میں آدم خان کو جھوٹا کہہ دیا تھا۔ وہ اب اس کے منہ پر تھوکنے کے لیے آئی ہے، مگر اپنے ساتھ چھری بھی لے آئی ہے وہ راؤ آدم خان سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔

مائی میراں : میرے پُتر نوں تیرے پیادے بھک لے گئے تے شامیں اوہدی لاش میرے ویہڑے پیا دھری نیں۔ میرا اکو پُتر سی اوہدیاں میری ساریاں نیں سی پُریاں اوہنوں ویکھ ویکھ جیوندی ساں۔ ہن اوہ اوتھے پہنچ گیا اے جتھوں دیاں اوہ تانگھاں لائی رکھدا سی۔ پر ویکھ اوہدی گل کیویں پوری ہوئی اے۔ اج توں طوطے وار پنجرے پیا ہویا ایں۔ تے میں آپنے پُتر دا آکھیا پورا کرن تیرے جوگی چھری کٹ کے لیائی آں۔ لے کھا !

راؤ آدم : میں نئیں کھاندا۔ توں وچ زہر رلا کے لیائی ایں

اس کے جواب میں مائی میراں جو کچھ کہتی ہے، وہ دنیا میں صرف ایک ماں ہی کہہ سکتی ہے۔

مائی میراں : جھلیا۔ کدی ماواں وی زہر کھواندیاں نیں۔ لے پُتر کھا لے۔ وساں خاں دا بھکا ایں۔

ان چند لفظوں نے اس کردار کو ایک عظیم کردار بنا دیا ہے اور اس میں مصنف کی اپنی عظمت بھی نمایاں ہے۔

مصنف نے آدم خان کے کردار کو گرایا نہیں۔ باوجودیکہ ایک عالم تو ہے اس کا سر نہیں جھکتا۔ سجاد حیدر نے اسے معمولی کردار نہیں بنایا۔ ایک بڑا کردار رہنے دیا ہے۔ شیکسپیئر کے المیہ کرداروں کی طرح۔ آخر میں جب تماشائی اسے بڑی لعنت ملامت کرتے ہیں تو بڑے جذباتی انداز میں ان سے مخاطب ہوتا ہے۔

راؤ آدم : (بڑے جذبے نال) اوئے سور میو، سانہوں ساہ تو اج پنجرے وچ بند آں تے میں بندہ ای نہیں رہیا۔ میں کرتی پنجرے دی نُکڑ تے بیٹھا راجا دھائیں۔ میں ساندل دیس دا سردار۔ اشرافاں دا اشراف راؤ آدم خان واں۔ راکھش دا ٹکا۔ رانی جاگر دا پتر جنہوں تہاڈے جیسے نیوں نیوں کے سلاماں کردے سن۔ میری چڑھتل دیکھ کے تہاڈے نواب جیسے کئی حاکماں دے منہ پھوک ہو جاندے سن۔ جنگ وچ میری سٹ کوئی سہ نہیں سی سکدا۔ نواب شمس الدین جے راتیں چوراں وانگر میرا خیمہ الٹ نہ دیندا تے میرے آپنے نمک حرام سپاہی اوہدے نال رل نہ جاندے تے اج ایس پنجرے وچ تہاڈے نواب صاحب ڈکے ہوندے۔

راؤ آدم خان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ جنگ میں دشمن کے ہاتھوں شکست کھا گیا ہے۔ اگرچہ یہ شکست دن کے اجالے میں نہیں رات کے اندھیرے میں ہوئی ہے اور اپنے غداروں کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس شکست سے اس کی اپنی ہی تذلیل نہیں ہوئی۔ اس کی برادری کی بھی ذلت ہوئی ہے۔ اس لیے تو اس کی برادری اسے دشمن کی قید سے نکال کر خود اپنی ذلت کا انتقام لینا چاہتی ہے، مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتی۔ جب اس کے پنجرے کو پہاڑ کی بلندی سے نیچے گرایا جاتا ہے، تاکہ یہ پنجرہ ٹوٹ جائے، اور وہ اپنی برادری کے بھیجے ہوئے آدمیوں کے ساتھ ساندل دیس چلا جائے، تو پنجرے کے ساتھ وہ خود بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

سجاد حیدر نے اپنے اس شاہکار ڈرامے میں ہر کردار کو اس کے حقیقی مقام پر دکھایا ہے۔ جذباتی رو میں یہ کسی کردار سے اس کی عظمت چھیننے کی کوشش نہیں کی۔ یہ کردار ان معنوں میں ہرگز علامتی نہیں کہ محض ایک نظریے کی مادی تشکیلیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ کردار زندہ اور جاندار ہیں۔ اپنی زندگی آپ گزارتے ہیں۔ اس مجموعے کے پانچویں اور آخری ڈرامے میں مصنف نے ایسے کردار پیش کیے ہیں جنہوں نے ماضی کی یادوں کو اپنے خواب بنا لیا ہے، اور اب لاشعور کے اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ یہ ایک بہت کامیاب مطالعہ ہے ان لوگوں کا جو خبر اور بے خبری کے عالم میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ڈرامے کا مرکزی کردار ہے منوجی جس کی سیرت کے بارے میں مصنف نے چند واضح اشارات دیے ہیں، اور وہ اشارات یہ ہیں:

"عقل ہوش دے شہر بھن کے اندر لیاں جذبیاں دے تار نال پُھرایا ہویا اک گُنجھا بندہ۔ جوش تے نرمی دوواں حالتاں وچ امید اخلاص اڈ پاؤں نہیں رہندا۔"

سب سے واضح اشارہ یہ ہے:

"میں اپنی گل اینج کرواں جیویں کسے ہور دا ذکر کر رہیا ہووے۔"

دوسرا اہم کردار ہے "آشی" جو روبی بھی ہے۔ اس کے متعلق مصنف بتاتا ہے:

"منوجی دی آشی تے ریاض دی روبی۔ خبر تے بے خبری دے دو سانگھے اُتے ٹکی ہوئی عورت۔ جیہڑی حیاتی دے ساہ مرادے میلے خواباں دیاں رگناں وچ رنگ کے دیکھنا چاہندی اے۔ اوہنوں منوجی دا خواب دی دھرتی ولاں پرے دی وار وانگر جھلن والا پیار سکھا ندا اے پر اوہ اک سودائی دی آپ مہاری بھٹت دا سیک برداشت نہیں کر سکدی:"

اس نفسیاتی تکون کا تیسرا زاویہ ریاض ہے جو روبی کا شوہر ہے اور قدرت کی ستم ظریفی سے ایک ماہر نفسیات بھی ہیں جو سلیقے سے زندگی بسر کرنے کا آرزو مند ہے، اور جو دوسروں کے دکھوں کا مداوا کرنا اپنا فرض گردانتا ہے۔

ان کے علاوہ راشد ہے منوجی کا جوان بیٹا۔ روشن ہے ریاض کی بیٹی۔ دونوں مستقبل کے خاکے میں اپنی محبت کے رنگ بھر رہے ہیں۔ مصنف نے ایک عجیب مسئلہ DILEMA پیدا کر دیا ہے منوجی کے بیک وقت دو کردار میں ایک کردار ہے۔ منوجی کا جو آشی کو اپنی آرزوؤں کا مرکز سمجھتا ہے، اور دوسرا کردار ہے پاپا کا ـــ جو راشد کا باپ ہے۔

آشی منوجی کی آشی ہے اور اس کے ساتھ ہے۔ روبی یہی ہے ریاض کی بیوی۔

یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے، اور مصنف اسے انسانی سطح پر پیدا کرتا ہے۔ میں اس فقرے پر زور دے رہا ہوں کہ مصنف نے ایک نفسیاتی الجھن کو نفسیاتی سطح پر نہیں انسانی سطح پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے ـــ اور اس سے ایک المیہ جنم لیتا ہے۔

میری نظروں میں سب سے دکھی کردار آشی، روبی کا ہے جو آخر میں چیخ اٹھتی ہے۔

روبی : (آواز وچ اتھرو نیں) تساں رل کے میرے دو ٹوٹے چا کیتے نیں۔ تسیں دی نہیں پچھاندے کیہڑی روبی اے تے کیہڑی آشی ؟ اک بُت وچ دو جندڑاں کیویں ڈک کے رکھاں جیہنوں اینج بے کفن کر کے ہن تہانوں میری پچھان دی نہیں۔ تے میں پچھنی آں ایس نمانی آشی دا گھر کیہڑا اے ؟

رون لگ پیندی اے

اس موقع پر اس کا شوہر ریاض کہتا ہے۔

ریاض : روبی، چل گھر چلیے

منوجی : آشی ! ہن تے اپنے گھر آ گئی ایہہ۔ ہن کیوں روندی ایں۔

روبی کا آخری فقرہ کتنا دردناک، المناک ہے: "تے میں پچھنی آں ایس نمانی آشی دا گھر کیہڑا اے ؟"

مصنف ایک نفسیاتی مسئلہ پیدا کر کے اسے نفسیاتی الجھنوں میں نہیں الجھاتا، چنانچہ ریاض جو روبی کا شوہر ہے ایک ماہر نفسیات سے زیادہ ایک ایثار پیشہ کردار نظر آتا ہے۔ اور یہی اس کی عظمت کی علامت ہے۔ ان ڈراموں کا مجموعی حیثیت سے جائزہ لینے کے لیے میں دو تین شقیں مقرر کر لیتا ہوں، تاکہ ہر بات ایک حد تک وضاحت سے ہو سکے۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ ان ڈراموں کا مصنف شعوری ارتقا کے واضح مراحل طے کر کے اس منزل پر پہنچا ہے۔ آغاز سفر میں اس کا رویہ زندگی اور کائنات کے مسائل کے بارے میں ایک رومانی اور جذباتی آدمی کا رویہ تھا۔ اس کی فکر دیسی فضا میں پرواز کناں تھا۔ وہ ہوا کے جھونکے کی طرح اس فضا میں سے گزرا تھا۔ اس نے ارد گرد کی زندگی کو چھو کر اس کا رس، اس کی تلخی اپنے اندر جذب کی تھی۔

دوسرے مرحلے میں وہ دیسی معاشرت سے ہٹ کر شہری محفل میں داخل ہو جاتا ہے ـــ یہ دور وہی ہے جب اس نے اپنے پہلے مجموعے "ہوا دے ہوکے" کے ڈرامے لکھے ہیں، اور ایک بہت مقبول ڈرامہ نویس کی حیثیت سے پنجابی ادب کے افق پر نمودار ہو چکا ہے۔ یہاں وہ فضا کو مس نہیں کرتا، ہوا کے جھونکے کی طرح بلکہ فضا کو اپنے اندر اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ دھرتی سے اس کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہو جاتا ہے۔

تیسرے مرحلے میں وہ انسانی رشتوں کی پیچ پیچ گرہوں کو کھولنے کی ذہنی جد و جہد کرتا ہے۔ انسان کے نفسیاتی کوائف کی گرہیں کھولنے کی اپنی سی کوشش کرتا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں اس کے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ "سورج مکھی" اشاعت پذیر ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کا تیسرا مجموعہ چھپتا ہے۔ ۱۹۷۸ء میں گویا تیسرے مجموعے کے یہ پانچ ڈرامے ۷۰ء سے ۷۸ء تک، آٹھ برس کی مدت میں لکھے گئے ہیں۔

یہ تیسرا مرحلہ سجاد حیدر کی تخلیقی زندگی کا نہایت اہم مرحلہ ہے۔ اس مرحلے پر پہنچ کر مصنف نے اپنے آپ کو پوری طرح پہچان لیا ہے۔ گویا جس طرح سجاد حیدر اپنے کرداروں کے باطن میں جھانک کر انہیں پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ خود بھی اپنے باطن میں جھانک کر اپنی مکمل طور پر پہچان چکے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس سے پہلے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے آپ کو پہچانے بغیر لکھا ہے یا اس میں اپنی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی سعی نہیں کی۔ ایسا ہرگز نہیں۔ کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ ایک مصنف یا فن کار ہر مرحلے پر خود کو پہچانتا ہے۔ مگر یہ پہچان اس مرحلے کی نسبت سے محدود ہوتی ہے۔ پھر ایک ایسا مرحلہ بھی آتا ہے جب پچھلے مرحلوں کی پہچانیں، ایک بڑی پہچان میں مدغم ہو جاتی ہے۔

اس مقام پر گوناگوں سوالات سامنے آ جاتے ہیں۔ لیکن ان کا واسطہ ایک الگ موضوع سے ہے، اور اس باب میں تفصیلاً گفتگو ہونی چاہیے، جس کا یہ موقع نہیں ہے۔ بہر حال سجاد حیدر کے ڈرامے

ان کی پختگی، فکر، متوازن طرزِ احساس اور غیر جذباتی اسلوبِ اظہار پر شاہد ہیں۔ سجاد حیدر جس سگو فیانہ روایت کو اپنے ساتھ لے کر چلے تھے۔ اور جس کی کچھ کچھ جھلک پہلے دور کے ڈراموں اور زیادہ جھلکیاں دُوسرے دور کے ڈراموں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اب وہ اس میں رس بس گئے ہیں یا یُوں کہہ لیجئے کہ یہ روایت ان کے اندر پُوری طرح رس بس گئی ہے۔ یہاں سجاد حیدر انسان کی باطنی زندگی کی دُنیا سے رابطہ تعلق قائم کرتے ہیں، لیکن ان کے مرکزی کردار —— حقیقی کردار ہیں۔ گوشت پوست کے بنے ہُوئے ہاں یہ ضرور ہے کہ سجاد حیدر نے ان کرداروں کو حقائق کی سطح پر لانے کے لیے جا بجا علامتی کردار بھی کر لیے ہیں۔ ان کے کئی کرداروں کے دو دو نام ہیں —— ایک نام تو ظاہری زندگی کی نمائندگی کرتا ہے، اور دُوسرا باطنی زندگی کی۔

سجاد حیدر اصلاً باطنی زندگی کے ڈرامہ نگار ہیں اس لیے انہوں نے خود کو ایک بہت بڑی آزمائش میں ڈال لیا ہے۔ باطنی کیفیات اپنے اظہار کے لیے علامتی زبان کا تقاضا کرتی ہے، لیکن اس نوع کی علامتی زبان قارئین کے لیے ایک قسم کا امتحان بن جاتی —— مگر سجاد حیدر نے اس معاملے میں بڑی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے ایسی زبان استعمال کی ہے جو ایک طرف تو کرداروں کے ساتھ بھی انصاف کرتی ہے، اور دوسری طرف پڑھنے والوں کو بھی لطف دے جاتی ہے۔ ان کی مکالمہ نگاری میں حقیقت پسندی بھی ہے۔ شگفتگی بھی، لطافتِ بیان بھی اور داخلی موسیقیت بھی۔ ان کی نثر ظاہر بڑی آسان اور سہل معلوم ہوتی ہے' مگر یہی نثر ہے، جس کے مصنّف کو ایک ایک لفظ کا انتخاب بڑی محنت اور وقت لگا کے کرنا پڑتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے: 'میں جب بھی کوئی اچھا شعر پڑھتا ہوں تو لگتا ہے کہ کوئی مسیح مصلوب ہوا ہے۔'

ایک اچھی نثر جیسی کہ سجاد حیدر کی ہے کے لیے بھی یہی قول دہرایا جا سکتا ہے۔

یہ ڈرامے —— ڈرامے کے مقررہ اصول و ضوابط سے بے نیاز ہیں۔ ان میں کلائمکس، اینٹی کلائمکس وغیرہ کی پابندی نہیں کی گئی، اور ہر ڈرامے کے لیے یہ پابندی ضروری بھی نہیں —— تاہم جب سٹیج کو پیش نظر رکھا جائے، تو سٹیج کی حد بندیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ڈرامے سٹیج کے لیے ہیں بھی نہیں۔ ان میں مصنّف نے ریڈیائی تکنیک کا خیال رکھا ہے —— اور یہ فنی زاویہ نگاہ سے ریڈیو ڈرامے ہیں اور ہر ڈرامے کا دورانیہ پینتیس سے پچاس منٹ کے درمیان ہے۔ جو لوگ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ڈرامہ صرف سٹیج کے لیے ہے، ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے لیے ہے —— پڑھنے کے لیے نہیں، انہیں ان ڈراموں کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔ یہاں ہر ڈرامہ پڑھنے والے کے ذہن پر بھرپور تاثر چھوڑتا ہے۔

پنجابی ادبی بورڈ نے یہ مجموعہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ شائع کیا ہے اور اس کے لیے بورڈ قابلِ مبارکباد ہے۔ سرورق عالمی شہرت کے مصوّر صادقین نے بنایا ہے، اور حقیقتاً بڑا خیال افروز ہے۔ ●●

ہمارے نام

ہمارے بھی کچھ مسائل ہیں

کسی بھی علم کے مکمل طور پر حصول کے لیے تھیوری کے ہمراہ پریکٹیکل یعنی عملی کام کا ہونا بہت لازمی ہے۔ چنانچہ پاکستان بھر کے میڈیکل کالجوں میں زیرِ تعلیم ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے طلبا۔ و طالبات کے لیے تھیوری کے ہمراہ پریکٹیکلز ایک لازمی جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میڈیکل کے پروفیشنل امتحانات میں اُن کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ طالب علم تھیوری میں پاس بھی ہو جائے تو پریکٹیکل میں کامیابی کے بغیر اگلی کلاس میں اس کی ترقی ممکن نہیں ہوتی۔ میڈیکل کالجوں کے طالب علم اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ پریکٹیکل میں کامیابی کے لیے اُن کی ذاتی محنت کے ساتھ ساتھ لیبارٹری سٹاف کا کس قدر دخل ہوتا ہے۔ بعض کا تو یہ خیال ہے کہ لیبارٹری سٹاف کے تعاون اور مدد کے بغیر طالب علم کا پریکٹیکل کے امتحان میں پاس ہونا قریباً قریباً ناممکن ہوتا ہے۔ عام دنوں میں لیبارٹری سٹاف ہی طالب علموں کو پریکٹیکل کراتے ہیں جب کہ ڈیمانسٹریٹر حضرات محض ڈیمانسٹریشن دیتے ہیں۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ پیشاب، خُون، بلغم اور دیگر اقسام کے ٹسٹ بھی لیبارٹری سٹاف کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں۔ اس لحاظ سے میڈیکل کالجوں میں خدمات سرانجام دینے والے لیبارٹری سٹاف کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ سرکاری سطح پر لیبارٹری سٹاف کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا گیا اور باوجود ٹیکنیکل کام کرنے کے انہیں نان ٹیکنیکل ملازمین میں شمار کیا جاتا ہے۔

ایک نہایت بڑی زیادتی جو لیبارٹری سٹاف کے ساتھ کی جا رہی ہے وُہ یہ ہے کہ ان کی تنخواہوں کے سکیل آج بھی وہی ہیں جو کئی سال قبل تھے، جب کہ اس عرصہ میں ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ ہو چکا ہے اور معیارِ زندگی بھی پہلے سے بہت بلند ہو گیا ہے۔ زندگی کے بڑھتے ہوئے اخراجات کے پیشِ نظر موجودہ انتہائی کم آمدنی میں لیبارٹری سٹاف کے لیے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالنا بہت مشکل ہے۔ سائنس کے ساتھ میٹرک پاس لیبارٹری ملازمین کو اس وقت تنخواہ کا سکیل نمبر ۵ دیا جا رہا ہے اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ دورانِ ملازمت ترقی کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں اس کے برعکس ملک کے دیگر سرکاری محکموں میں میٹرک پاس ملازمین کو سکیل نمبر ۵ دیا جاتا ہے، اور ترقی کے مواقع بھی میسّر ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ محکمہ صحت لیبارٹری سٹاف کے ساتھ یہ ناانصافی کیوں روا رکھے ہوئے ہے جس کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے۔

میں آپ کے جریدے کی وساطت سے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر پنجاب کے مشیرِ صحت اور سیکرٹری محکمہ صحت سے مطالبہ کرتا ہوں کہ لیبارٹری سٹاف کے موجودہ سکیلوں پر نظرِ ثانی کی جائے اور سالِ رواں کے بجٹ کی منظوری سے قبل نئے اضافی سکیلوں کا اعلان کیا جائے تاکہ پریشان حال ملازمین کو سکھ اور چین کے لمحات نصیب ہو سکیں۔

(مجاہد نقوی جنرل سیکرٹری لیبارٹری سٹاف ویلفیئر ایسوسی ایشن علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور)

مارشل لاء کا مذاق

پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون اے کے قطعی احکامات کی عمداً رُوگردانی کرتے ہوئے مسلسل چار ماہ سے مارشل لاء کا منہ چڑا رہے ہیں۔ مجھے میری ملازمت پر بحال کیے جانے کے خلاف انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا ہے۔ ان کا یہ طرزِ عمل گورنر پنجاب کے فیصلے کے بعد ختم ہو جانا چاہیئے تھا، مگر ان کا ارشاد تو یہ ہے کہ اس ناجائز مارشل لاء کی حیثیت اُن کی نظروں میں جوا سے بھرے ہوئے غبارے سے زیادہ نہیں۔ 'موجودہ مارشل لاء کی یوں تضحیک و تذلیل مارشل لاء انتظامیہ ہی نہیں پورے ملک و ملت کے لیے بھی لمحۂ فکریہ ہے۔

(مرتضٰی علی خان کلرک معرفت محمد سلیم خان، لیڈی ولنگڈن، ہسپتال، لاہور)

ایک گزارش - ریلوے والوں سے

ریلوے کا محکمہ جہاں بڑے شہروں کے لیے کئی تیز رفتار گاڑیوں کا بندوبست کیے ہوئے ہے، اور صاحبِ حیثیت لوگوں کیلئے ائیر کنڈیشنڈ ڈبوں کی فراہمی کے لیے عموماً پریشان رہتا ہے، وہاں اسے بریخ لائنز اور میانوالی جیسے دُور افتادہ اور پس ماندہ اضلاع کے لوگوں کی سفر کے بارے بُنیادی ضرورتوں کا بہت کم ہی خیال رہتا ہے۔ یہاں کے لوگ چونکہ اپنے حقوق کے حاصل کرنے میں سرگرمِ عمل نہیں ہیں اس لیے لمبی مدت کے بعد کبھی کبھار ریلوے انہیں خیرات ہی میں کچھ دیتا ہے۔

میانوالی، اور اُس کے ملحقہ صُوبہ سرحد کے علاقہ کو کراچی یا اس سائیڈ جانے کے لیے سرگودھا، فیصل آباد یا لاہور جا کر ٹرین پکڑنی پڑتی ہے۔ اس سے جہاں وقت کے لحاظ سے اُن کا ایک دن ضائع ہوتا ہے، وہاں اُن کو کرایہ اور طعام وغیرہ کی صورت میں اوسطاً چالیس پچاس روپے مزید خرچ کرنے پڑتے ہیں مسافر گاڑیوں کے سلسلے میں ریلوے کے موجودہ انتظام سے کراچی جانے والے پشاور سے مسافروں کو براستہ سرگودھا فیصل آباد یا لاہور جانا پڑتا ہے، جس سے اُن کو بارہ سے سولہ گھنٹے زائد وقت اور زائد اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اگر مال گاڑیوں کی طرح مسافر گاڑیوں کو براستہ کندیاں چلا دیا جائے، تو عوام کو بہت سہولت ہو جائے گی۔ مال گاڑیاں کم فاصلہ ہونے کی بناء پر بہت جلد منزلِ مقصود

تک پہنچ جاتی ہیں۔ پہلے جہاں ایک ماہ میں کراچی سے پشاور مال پہنچتا تھا، اب ایک ہفتہ میں پہنچنے لگتا ہے۔ اگر تھل پسنجر یا تھل ایکسپریس کو ملتان سے کراچی تک بڑھا دیا جائے، تو اس سے میانوالی کے علاوہ صوبہ سرحد کے باشندوں کو غیر معمولی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

کراچی جانے اور واپس آنے کے لیے سرگودھا اور فیصل آباد سے سپر ایکسپریس اور چناب ایکسپریس کے لیے کئی ڈبے بڑھائے جاتے ہیں، اور جب سے وفاقی کابینہ میں جھنگ سے نوابزادہ افتخار احمد انصاری کی شمولیت ہوئی ہے، جھنگ کے باشندوں کو ایک ڈبہ کی سہولت مل گئی ہے۔ جھنگ سے شٹل ٹرین کے ذریعے ایک ڈبہ شورکوٹ آجاتا ہے، اور پھر چناب ایکسپریس کے ساتھ اٹیچ ہو جاتا ہے۔ اگر تھل پسنجر یا تھل ایکسپریس یا ماڑی انڈس ٹرین 219/DN (280 DN) کے ساتھ ایک یا دو ڈبے میانوالی سے اٹیچ کر دیئے جائیں، اور انہیں کراچی جانے والی ایکسپریس کے ساتھ شامل کیا جائے، تو پھر بھی کافی حد تک پبلک اور سرکاری ملازمین کی تکالیف دور ہو سکتی ہیں۔

سرگودھا ایکسپریس کو میانوالی میں ایکسٹینڈ کر دینے سے میانوالی کو خاطر خواہ فائدہ ہوا ہے اور میانوالی کے نقطۂ نگاہ سے اس کے موجودہ اوقات اتنے مناسب نہیں ہیں۔ گرمیوں میں بھی اوقات مناسب ہیں گے، بشرطیکہ ان میں تھوڑی بہت ترمیم کر دی جائے۔ اس ایکسپریس گاڑی کو اس وقت لاہور سے سرگودھا پانچ گھنٹے اور میانوالی ۹ گھنٹے لگتے ہیں۔ اس میں دو گھنٹوں کی تخفیف کی گنجائش ہے۔ اگر کندیاں سے اسے واپس لاہور جانے کے لیے نیا انجن دیا جائے (کندیاں میں پاور کا انتظام موجود ہے) تو اس طرح ۳۵، ۴۰ منٹ کی بچت ہو سکتی ہے اور رننگ میں گھنٹہ ہوا گھنٹہ کی باسانی بچت کی جا سکتی ہے۔ اس شکل میں میانوالی سے روانگی صبح ایک بج کر چالیس منٹ کے بجائے ۳ بجے اور لاہور آمد ساڑھے دس بجے کے بجائے ۱۰ بجے ہو سکتی ہے۔ اس تدبیر سے دو گھنٹے وقت کی بچت اور اس سے محکمہ ریلوے کی آمدنی میں حیرت انگیز اضافہ ہو گا۔

میانوالی سے راولپنڈی جانے کے لیے دن کے وقت میں ریل کار (ڈی ۱۶۳ | پی ۱۴۵۴) ایک تیز رفتار گاڑی ہے، جس سے داؤدخیل سے آگے پہاڑی علاقہ کے لوگ بہت مستفید ہوتے ہیں، لیکن بدقسمتی سے یہ ریل کار دو ڈبوں پر مشتمل ہے جو مسافروں کے لیے ناکافی ہے، محکمہ ریلوے اگر تین ڈبے کر دے اور اسے ایسا ماسٹر مہیا کرنے جو دو انجنوں والا ہو تو میانوالی اور چھب کے علاقہ کے لوگ محکمہ کے وزیر اور افسران کو بہت دعائیں دیں گے۔

میانوالی سے صبح کے وقت ریل کار (ڈی ۱۳۶ | یو پی ۱۳۵) کا سرگودھا پہنچنے کا وقت ساڑھے آٹھ بجے ہے اور وہاں سے کراچی جانے کے لیے چناب ایکسپریس کی روانگی ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ہے۔ اب چناب ایکسپریس کو چلانے کے لیے مذکورہ ریل کار کو سگنل کے قریب روک لیا جاتا ہے۔ اگر اس ریل کار کو دس پندرہ منٹ پہلے پہنچا دیا جائے جو خوش قسمتی سے سرگودھا میں بچت کے ذریعے بھی ممکن ہے، تو سینکڑوں مسافر باآسانی چناب ایکسپریس میں سوار ہو سکتے ہیں۔ ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ بھی اس تبدیلی کے مجاز ہیں، توقع ہے اس فروگزاشت کو فوری طور پر دور کیا جائے گا۔

کاروباری اور دفتری اوقات کے لیے لاہور سے آنے اور لاہور جانے کے لیے میانوالی، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان کے اضلاع اور اُن کے ملحقہ علاقے کے باشندوں کے لیے موزوں ترین گاڑی ماڑی انڈس ہے، لیکن اُن کی بدقسمتی یہ ہے کہ گاڑی بارہ سے سولہ گھنٹے منزل مقصود تک پہنچنے میں لیتی ہے اور یہی وجہ ہے ماڑی، میانوالی اور کندیاں سے لاہور جانے والے مسافر لاہور کا ٹکٹ خریدنے کی بجائے فیصل آباد کا ٹکٹ لے کر وہاں اُتر جاتے ہیں اور ٹرانسپورٹ کے ذریعے ماڑی انڈس ٹرین سے دو تے چھ گھنٹے پہلے لاہور پہنچ جاتے ہیں اور اسی طرح لاہور سے واپس آنے والے اس علاقہ کے مسافر ماڑی انڈس ٹرین کی بجائے بسوں پر سفر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، جس سے پبلک کو از حد تکلیف ہے، اور محکمہ ریلوے کو مالی لحاظ سے نقصان پہنچ رہا ہے، محکمہ ریلوے اگر اس گاڑی کو رننگ ٹائم میں گھنٹہ ڈیڑھ کی کمی کر دے اور لاہور اور میانوالی گاڑی وقت پر پہنچانا یقینی بنا دیں، تو مسافر ٹرانسپورٹ کی بجائے ماڑی انڈس پر سفر کرنے کو ترجیح دیں گے۔

(خان زمان خان)

مکتوب بستی

خیر بخش مری کی خواہش پر اہم تبادلے

(نمائندہ تکبیر، بستی)

حکومت نے بلوچستان کے مخصوص سیاسی اور قبائلی حالات کے پیش نظر اہم اور دور رس نتائج کے حامل اقدامات کیے ہیں۔ کوہلو ایجنسی (مری بگٹی علاقہ) میں پروجیکٹ ڈائریکٹر کی نئی آسامی قائم کر کے اس پر میر گل خان نصیر کے بھائی اور کالعدم نیپ کی کالعدم دیہی پولیس کے سابق کمانڈر ریٹائرڈ کرنل سلطان احمد کو تعینات کیا گیا ہے۔ باخبر حلقوں کا کہنا ہے کہ یہ محض انتظامی قدم نہیں، بلکہ بالواسطہ طور پر اس کا تعلق سیاست سے ہے۔ بلوچستان کے گورنر رحیم الدین خان نواب خیر بخش مری کے دیرینہ دوست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نواب مری آئے دن گورنر ہاؤس میں گورنر سے گپ شپ کرتے دیکھے جا سکتے ہیں جب کہ اپنی عام زندگی میں وہ الگ تھلگ رہنے والے آدمی ہیں۔

ایک اور نئی تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ مسٹر جمشید برکی کو بستی ڈویژن کا کمشنر مقرر کر دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ مری بگٹی کا علاقہ بستی ڈویژن میں آتا ہے۔ قیاس یہ ہے کہ یہ تقرری نواب مری کی خواہش پر ہوئی ہے

معتبر ذرائع کے حوالے سے سیاسی حلقوں میں بعض انکشافات ہو رہے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ بستی سے ۱۶ میل دور ماچھی کھوہ میں بھٹو کے دور اقتدار میں ہزار ایکڑ سرکاری زرعی اراضی صرف ایک ہی خاندان کے افراد کو الاٹ کی گئی۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں غیر الاٹ شدہ اراضی ہزاروں ایکڑ موجود ہے، جس پر یہی خاندان ناجائز طور پر قابض ہے۔ اگر کوئی غریب کسان وہاں پر کاشت کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو اُس خاندان کے افراد ان پر جعلی مقدمات کی بھرمار کر کے اسے پریشان کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ موجودہ حکومت نے ہدایات جاری کر رکھی ہیں کہ سرکاری زرعی اراضی صرف غریب کسانوں کو دی جائیں جو خود کاشت کرنے والے ہوں اور جن کی ذاتی زرعی اراضی موجود نہ ہوں اور جو آمدنی کے دوسرے وسائل نہ رکھتے ہوں۔ علاقے کے کسانوں نے مطالبہ کیا ہے کہ ایک ہی خاندان کو وسیع اراضی کرنے کے واقعات کی تحقیقات کرائی جائے، اور یہ زمین بے زمین کسانوں کو الاٹ کی جائے۔

ایک اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ ٹریبونل سسٹم کے کالے قوانین کا طریقہ کار اب بھی موجود ہے۔ اس پر ستم یہ کہ یہاں کے ٹریبونل ممبران کی اکثریت پیپلز پارٹی سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ طریقہ کار کی بنیادی شرائط کی پابندی بھی نہیں کرتے۔ اس طرح غریب لوگوں پر انصاف کے دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ عوام کا مطالبہ ہے کہ اب جب کہ ملک میں شرعی قوانین کا اعلان ہو چکا ہے، تو اس پرانے ظالمانہ طریق کار کو ختم کیا جائے۔

میری مدد کیجئے

عرض یہ ہے کہ میں غریب سید والدین کا بچہ ہوں۔ ذرائع آمدنی بے حد مختصر ہیں۔ مجھے محض اس اُمید پر کالج میں داخل کرایا گیا ہے کہ شاید کسی انسان دوست کا سہارا مل سکے گا جو کہ تعلیم جاری رکھنے میں میری مدد کریں۔ صاحب حیثیت لوگوں سے درخواست ہے کہ براہ کرم میری تعلیم جاری رکھنے میں مدد کریں کہ اگر مجھے کسی سے تعاون حاصل نہ ہوا تو میں اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔

(میر افتخار احمد فسٹ ایئر پری میڈیکل کلاس رول نمبر ۱۴۴ گورنمنٹ جہانزیب کالج سیدو شریف، سوات)

اپیل - تعمیر مسجد کے لیے

جو شخص مسجد بنائے گا اللہ اس کا گھر جنت میں بنائیں گے۔ (حدیث)

۱۹۱ اتاترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور میں زیر تعمیر مسجد کے لیے کثیر سرمایہ درکار ہے۔ مخیر اور نیک دل حضرات سے اپیل ہے کہ وہ اللہ کے گھر کی تعمیر کے لیے تعاون کریں۔

منجانب: جنرل سیکرٹری انجمن جامع مسجد (رجسٹرڈ)، الاٹ بک کارنر، فلیمنگ مارکیٹ شاہراہ قائداعظم لاہور فون نمبر ۶۹۸۲۳۴

ترسیل زر کا پتہ (۱) ۵۵/۲۱۸ نیشنل بنک ماڈل ٹاؤن سیونگ اکاؤنٹ (۲) نیشنل بنک نیو گارڈن ٹاؤن سیونگ اکاؤنٹ ۲۹۸۰/SB



مسٹر بھٹو کی پھانسی پر

پہلی چشم دید رپورٹ

مسٹر بھٹو کو جب پھانسی دی گئی تو ان کا رویہ کیا تھا؟ جب پھانسی کی خبر ان تک پہنچی تو انہوں نے کس ردِ عمل کا اظہار کیا، مسٹر بھٹو کے آخری ایام کے پس منظر میں ان تاریخی لمحات کی یہ اوّلین مستند اور تفصیلی رپورٹ ہے۔

اس کا راوی وہ اعلیٰ افسر ہے، جو آخری مراحل کے دوران خود موقع پر موجود رہا، اور دوسرے مراحل کی اس سے زیادہ تصدیق شدہ رپورٹ کسی کے پاس ہو ہی نہیں سکتی۔

ہم اس افسر کا نام، خود اس کی خواہش پر شائع نہیں کر رہے، اور یہی صحافتی اخلاق کا تقاضہ ہے ـــــ لیکن اس رپورٹ کو جھٹلانا کسی طور پر بھی ممکن نہیں۔ یہ پاکستان کے اخبارات اور جرائد میں شائع ہونے والی پہلی چشم دید رُوداد ہے۔ اسے "بادبان" کے لیے جناب ہارون الرشید نے مرتب کیا (ایڈیٹر)

❁*❁

مَیں نے بھُٹّو کو پھانسی چڑھتے دیکھا

یہ ۲۳ مارچ کی بات ہے ـ

ایک کے بعد دوسرا تار کھُلا ـــــ ذوالفقار علی بھٹو اور یحییٰ بختیار آمنے سامنے کھڑے تھے ـ چند سیکنڈ تک خاموشی کا وقفہ رہا اور پھر یحییٰ بختیار نے تیزی سے کہا: جناب! میں کوئی اچھی خبر نہیں لایا ـــــ سپریم کورٹ نے نظرثانی کی اپیل مسترد کر دی ہے ـــــ بھٹو خاموش رہے۔ پریشانی کے آثار چہرے پر اُمڈ آئے تھے۔ انہوں نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے جلدی سے سگار سلگایا۔ اور لمبے لمبے کش لینے لگے ـ یحییٰ بختیار نے انہیں تسلی دی کہ یہ اس کھیل کا آخری داؤ نہیں ـــــ ابھی کچھ راستے باقی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ سپریم کورٹ کے فیصلے کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ رحم کی اپیل منظور کرنے کے لیے سفارش کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لیے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے ـــــ بھٹو انہیں خاموشی سے سُنتے رہے۔ اور پھر انہوں نے سوال کیا: IT HAS BEEN REJECTED UNANIMOUSLY?

("کیا اپیل کو متفقہ طور پر مسترد کیا گیا ہے؟") ـــــ "ہاں جناب!" ان کے وکیل نے جواب دیا۔

یحییٰ بختیار ابھی جیل ہی میں موجود تھے کہ بھٹو کے لیے جیل کے دروازے پر دوپہر کا کھانا دیا گیا ـ جیل حکام نے کھانا وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ سپریم کورٹ سے مجرم کی اپیل حتمی طور پر مسترد ہو چکی ہے اس لیے مجرم ان رعایتوں کا مستحق نہیں رہا جو عدالت نے اسے فراہم کی تھیں۔ سپرنٹنڈنٹ نے پہلی بار مجرم کے لیے جیل کا کھانا تیار کرنے کا حکم دیا۔ یہ کھانا خصوصی نگرانی میں ایک مشقتی نے تیار کیا۔ اور وہی یہ کھانا لے کر مسٹر بھٹو کے سیل کی طرف گیا۔ مگر بھٹو نے کھانے سے انکار کر دیا ـــــ انہوں

نے شام تک کچھ نہیں کھایا، البتہ برابر سگار پیتے رہے ـــــ مدتوں سے، جیل آنے سے پہلے سے، مسٹر بھٹو کی یہ عادت رہی تھی کہ وہ جب پریشان ہوتے ـــ اُلجھ جاتے یا سوچنے کی ضرورت محسوس کرتے، تو سگار پیتے ـــــ آج ان کی تمباکو پینے کی رفتار غیر معمولی تھی۔ زیادہ وقت وہ پلنگ پر لیٹے رہے، مگر وقفوں سے اُٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیتے۔ جیل جانے کے بعد ان میں ایک نئی عادت پیدا ہوئی تھی، وہ خود کلامی کے بھی عادی ہو گئے تھے ـــــ آج ان کی خود کلامی بھی معمول سے زیادہ تھی ـــــ وہ بار بار ٹہلتے، بڑبڑاتے اور پھر جیسے تھک گئے ہوں، بستر پر گر پڑتے۔

سہ پہر ہی کو جیل حکام کو "اوپر" سے ہدایت موصول ہو گئی کہ مسٹر بھٹو کے لیے گھر سے کھانا منگوانے کی رعایت برقرار رکھی جائے؛ چنانچہ ان کے گھر والوں کو فوراً ہی اس کی اطلاع دے دی گئی اور شام کو ان کے لیے دوبارہ گھر سے کھانا بھیجا گیا، مگر انہوں نے یہ کھانا بھی نہیں کھایا ـــــ جیل حکام نے انہیں اصرار کر کے کچھ دودھ پلا دیا۔

ایک رات پہلے، ۲۳ اور ۲۴ مارچ کی درمیانی رات وہ بہت کم وقت کے لیے سو سکے تھے ـــــ مسٹر بھٹو "انسومنیا" کے مریض ہیں اور عام لوگوں کی نسبت بہت کم سوتے ہیں، مگر گذشتہ رات وہ غیر معمولی طور پر کم وقت کے لیے سوئے؛ اگرچہ دیر تک بستر پر لیٹے رہے، مگر ان کا زیادہ تر وقت کتابوں سے دل بہلاتے گزرا ـــ ان میں سے زیادہ تر کتابیں فلسفے اور تاریخ سے متعلق ہیں اور سب کی سب غیر ملکی مصنفوں کی لکھی ہوئی ہیں ـــــ راولپنڈی جیل میں مسٹر بھٹو نے یہ رات، سب راتوں سے زیادہ بے چینی کے ساتھ گزاری۔

مسٹر بھٹو سے شیو کا سامان اور بعض دوسری چیزیں اسی روز واپس لے لی گئیں ـــ قاعدہ یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز قیدی کے پاس نہ رہے، جس سے وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہو، خود کشی کر سکتا ہو ـــ مسٹر بھٹو اب ایک بدلی ہوئی شخصیت تھے۔ وہ فوراً بحث و مباحثے پر نہیں اتر آتے تھے اور نہ سخت جملے کہتے تھے؛ چنانچہ جب ان سے سامان واپس لیا گیا، تو وہ خاموش رہے۔

ان کے زندہ رہنے کی امید یقیناً کم ہو گئی تھی اور اس کے آثار ان کے چہرے پر دیکھے جا سکتے تھے۔ ان کے چہرے پر داڑھی کے بال بڑھ رہے تھے اور پہلی بار انہیں اس کی پرواہ نہیں تھی۔

جب ان سے کچھ سامان واپس لیا گیا، تو جیل حکام نے انہیں سونے کے لیے پلنگ دیا، اس پر مسٹر بھٹو نے شکایت کی کہ وہ سخت بستر پر نہیں سو سکتے۔ کچھ ہی دیر کے بعد ان کے لیے نرم بستر کا بندوبست کر دیا گیا ـــ جیل حکام ان کے سیل میں پہنچے اور اطلاع دی کہ ان کا بستر تبدیل کیا جا رہا ہے، تاکہ وہ آرام سے سو سکیں ـــــ "اب مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے" ـــ مسٹر بھٹو نے کہا ـــ اب وہ ذہنی طور پر اپنے آپ کو نئی صورتِ حال کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ پلنگ آخری دن تک ان کی کوٹھڑی کے باہر پڑا رہا۔

مسٹر بھٹو نے اپنا گدا زمین پر بچھا لیا اور پھر اسی پر سوتے رہے۔ ان کا کموڈ تبدیل کر دیا گیا، مگر بعض اخباروں کی یہ اطلاع غلط تھی کہ جیل حکام نے اپنے طور پر ایسا کیا ـــ درحقیقت یہ تبدیلی مسٹر بھٹو کی خواہش پر کی گئی تھی۔ مسٹر بھٹو کو ایک اور رعایت بھی دی گئی کہ انہیں پھانسی کے مجرموں کا مخصوص لباس پہننے کو نہیں کہا گیا، جس میں آزار بند نہیں ہوتا، وہ آخر وقت تک گھر کا لباس پہنتے رہے ـــ کرتا اور شلوار ـــــ جب عدالتِ عظمٰی سے آخری اپیل مسترد ہونے کے بعد وہ انتظامیہ کی تحویل میں چلے گئے، تب بھی ان کی بیشتر رعائتیں برقرار رہیں۔

مسٹر بھٹو کے وکلا ان سے ملتے رہتے اور اس موضوع پر ان کے درمیان



یہ رات
بڑی
بیقراری
سے گزری









تبادلۂ خیال ہوتا رہا کہ رحم کی اپیل دائر کی جانے یا نہ کی جانے۔ مسٹر بھٹو اور عبدالحفیظ پیرزادہ یہ سمجھتے تھے کہ رحم کی اپیل کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ ان کا خیال تھا کہ عالمی دباؤ اور اندرون ملک ہنگاموں کے خطرے کے سبب ان کی سزا میں یقینی طور پر کمی کر دی جائے گی۔ مگر آخر کار انہیں اپنی اپنی رائے میں تبدیلی کرنا پڑی، جب انہوں نے دیکھا کہ صدر ضیاء الحق برابر یہ موقف اختیار کیے ہوئے ہیں کہ وہ عالمی دباؤ قبول نہیں کریں گے اور رحم کی اپیلوں پر اپنی کابینہ کے سوا کسی سے مشورہ نہیں کریں گے۔

۳۱ مارچ کو جب رحم کی اپیل کا آخری دن تھا، انہیں مس بے نظیر بھٹو، اور نصرت بھٹو سے ملنے کا موقع دیا گیا ـــــ انہوں نے نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو سے رحم کی اپیل پر تبادلۂ خیال کیا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کی بیوی اور بیٹی کی طرف سے رحم کی کوئی درخواست نہ دی جانے۔ اس روز انہوں نے اپنی پہلی بیوی شیریں امیر بیگم سے بھی ملاقات کی ـــ ان کی دوسری بیوی نے رحم کی درخواست پیش کرنے کی اجازت طلب کی، جسے مسٹر بھٹو نے سختی سے مسترد کر دیا۔ انہوں نے ایک گھنٹے تک اپنے خاندانی امور اور زمینوں کے بارے میں بات چیت کی۔

جیسے ہی شیریں امیر بیگم جیل سے رخصت ہوئیں مسٹر بھٹو نے حفیظ پیرزادہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ یحییٰ بختیار کے علاوہ پیرزادہ ہی وہ شخص ہیں جو جنرل ضیاء الحق سے اپنی ملاقات کے حوالے سے بار بار مسٹر بھٹو کو یہ تاثر دیتے رہے کہ ان کی جان بچ جائے گی؛ چنانچہ آخری وقت پر مسٹر بھٹو نے انہیں آخری سہارے کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ بار بار پیرزادہ کی تلاش میں فون کرتے رہے ـــ آخر کار وہ انہیں مل گئے ـــ سپرنٹنڈنٹ نے کہا وہ فوری طور پر جیل پہنچ جائیں۔ بھٹو ان سے ملنے کے لیے بیتاب ہیں ـــ جیسے ہی پیرزادہ بھٹو کے سیل میں پہنچے، سابق وزیر اعظم نے ان سے کہا کہ وہ رحم کی اپیل دائر کر دیں۔ پیرزادہ نے اجازت طلب کی کہ وہ واپس جا کر درخواست کا مسودہ تیار کر کے لاتے ہیں۔ بھٹو صاحب اس پر دستخط کر دیں، مسٹر بھٹو نے جواب میں کہا: نہیں! میں اس پر دستخط نہیں کروں گا، یہ اپیل میری طرف سے نہیں، آپ کی طرف سے ہو گی۔

پیرزادہ نے رحم کی اپیل پیش کی اور اسی روز پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی نے بھی رحم کی درخواست کر دی ـــ اپیل کرنے والوں میں مسٹر بھٹو کی بڑی بہن بھی شامل تھیں۔ بھٹو نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا تھا، مگر انہوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا ـــ ملاقات کے آخری لمحے واپس آتے ہوئے اُنہوں نے پُرنم آنکھوں کے ساتھ اپنے بھائی سے کہا، "ہمیں تمہاری زندگی کی ضرورت ہے"!

۳۔ اپریل کو بیگم نصرت بھٹو اور مس بے نظیر بھٹو کو ملاقات کرنے کے لیے کہا گیا ـــــ مسٹر بھٹو سیل کے اندر تھے، جب کہ ان کی بیگم اور بیٹی کو سیل کے دروازے کے ساتھ کرسیوں پر بٹھایا گیا تھا۔ اس سے پہلی ملاقاتوں میں وہ اندر جا کر ان سے گفتگو کرتی تھیں۔ بے نظیر اپنے باپ کے قریب جا کر لیٹ جاتیں جو آخری دنوں میں فرش پر فوم کا گدا بچھا کر سوتے تھے اور دونوں سرگوشیوں میں گفتگو کرتے۔ مگر آج کی ملاقات آخری تھی، مسٹر بھٹو کو بتا دیا گیا تھا، اور ان کے ملاقاتیوں کو بھی، لیکن مسٹر بھٹو کو یقین نہ آیا، تاہم انہوں نے درخواست کی کہ ملاقات زیادہ عرصہ جاری رہنے کی اجازت دی جائے، سو وہ تین گھنٹوں پر پھیل گئی۔ طویل ملاقات کے دوران ان کے درمیان تقریباً پانچ فٹ کا فاصلہ تھا ـــ بے نظیر اپنے باپ سے باتیں کرتے ہوئے بار بار رو پڑتی تھیں، مگر نصرت بھٹو کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے، اگرچہ ان کے چہرے پر ویرانی تھی اور رنج کے آثار تھے ـــ انہوں نے کچھ زیادہ باتیں بھی نہیں کیں ـــــ زیادہ وقت مسٹر بھٹو بولتے رہتے یا بے نظیر کے سوالوں کے جواب دیتے رہے۔

ملاقات کے آغاز میں بیگم بھٹو نے انہیں بتایا کہ انہوں نے جیل کے حکام سے پوچھا ہے کہ کیا یہ آخری ملاقات ہے ـــ اس پر انہیں بتایا گیا کہ ہاں یہ آخری ملاقات ہے ـــ بھٹو اس سے دہشت میں تو تھے، لیکن انہیں اس کا یقین نہ تھا۔ ان کا اب بھی یہی تاثر تھا کہ جیل حکام انہیں خوف زدہ کر کے ان کے اعصاب توڑ دینا چاہتے ہیں، اور ان سے رحم کی درخواست حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ جس سے دنیا کو معلوم ہو کہ بھٹو ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں ـــ مسٹر بھٹو کو ان کے وکیل اور دوست یقین دلا چکے تھے کہ انہیں پھانسی کسی طور بھی نہیں دی جا سکتی، اور مسٹر بھٹو خود بھی اس بھنور سے نکلنے پر تیار نہ تھے، لیکن ان کی بیگم اور بیٹی کی کیفیت بہت مختلف تھی۔ مسٹر بھٹو نے اس رائے کا اظہار کیا کہ صدر ضیاء الحق ان سے سودے بازی کرنے کی فکر میں ہیں۔

ملاقات کے آغاز ہی میں مسٹر بھٹو نے کچھ کاغذ طلب کیے تھے، چنانچہ انہیں فل سکیپ کے سفید کاغذوں کا ایک دستہ فراہم کیا گیا ـــ انہوں نے ایک کاغذ کو درمیان سے تہہ کر کے پھاڑا ـــ اس کے دو حصے کیے۔ دونوں پر الگ الگ کچھ لکھا اور انہیں اپنی بیٹی اور بیوی کے حوالے کر دیا ـــ کچھ دیر تک ان کے درمیان اسی طرح تحریری گفتگو ہوتی رہی ـــ لیکن اچانک انہوں نے کاغذ تہہ کر کے ایک طرف رکھ دیے اور ان سے زبانی گفتگو کرنے لگے۔ اسی گفتگو کے دوران ان کے محفوظ کاغذات کا ذکر بھی آیا، احتیاط کے باوجود، پانچ فٹ کے فاصلے پر ہونے والی گفتگو نگران عملے کے کانوں تک پہنچ ہی جاتی تھی

وہ یادداشت پر زور دینے کے لیے باربار اپنا ہاتھ ماتھے کی طرف لے جاتے اور پھر کاغذات کی بات شروع کر دیتے۔

یہ ملاقات اس طرح ختم ہوئی کہ بیگم بھٹو پر سناٹا چھایا ہوا تھا — بے نظیر رو رہی تھیں اور مسٹر بھٹو کے چہرے پر بے یقینی کے سائے تھے مسٹر بھٹو کے سیل سے واپس آتے ہوئے بیگم بھٹو اور بے نظیر نے جیل کے دفتر میں چیخ کر کہا: ہم صدر ضیاالحق سے ملنا چاہتی ہیں ہمیں فوراً ان کے پاس لے چلو۔ افسرانچارج نے انہیں انتظار کرنے کے لیے کہا اور اعلیٰ حکام سے فون پر رابطہ قائم کیا — جواب ملا: وہ کچھ کہنا چاہتی ہیں، تو لکھ کر دے دیں۔ ملاقات ممکن نہیں ہے —

ایک خبر تھی کہ ۲ اپریل کی شام کو نماز مغرب پڑھنے کے بعد پاکستان کے فوجی حکمران نے رحم کی اپیلیں حتمی طور پر مسترد کر دی تھیں اور فیصلہ کر لیا تھا کہ سب سے پہلے مسٹر بھٹو کو پھانسی دی جائے گی، اور اس کے بعد باقی مجرموں کو؛ چنانچہ پھانسی لگانے کے انتظامات شروع کر دیے گئے تھے۔

شام کو جیل حکام دوبارہ مسٹر بھٹو کے پاس پہنچے۔ سپرنٹنڈنٹ نے انہیں سنجیدگی سے کہا آج رات انہیں پھانسی دے دی جائے گی۔ یہ پہلا موقع تھا، جب مسٹر بھٹو نے محسوس کیا کہ یہ خبر درست ہو سکتی ہے، تاہم اب بھی ان کا ردِ عمل یہی تھا کہ انہیں خوف زدہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر نے ان کی صحت کا معائنہ کیا۔ چند منٹ کے معائنے کے بعد ڈاکٹر نے حکام کو بتایا کہ مجرم کی صحت بالکل ٹھیک ہے اور اسے پھانسی دی جا سکتی ہے — مسٹر بھٹو کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی — انہوں نے ۲۴ مارچ کے بعد سے اب تک شیو نہیں بنایا تھا، اور خوش پوش، خوش مزاج بھٹو کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے اتنے دن شیو نہیں بنائی تھی۔ جیل حکام واپس آنے لگے، تو بھٹو نے مطالبہ کیا کہ انہیں شیو کرنے کا سامان فراہم کر دیا جائے انہوں نے کہا: I DONT WANT TODIE A MOLVIES (DEATH) یہ کہتے ہوئے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

انہوں نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ انہیں ایک جائے نماز اور تسبیح فراہم کی جائے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے اس طرح کی خواہش کی — اس سے پہلے ایک موقع پر جب اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ وہ نماز پڑھنے لگے ہیں، تو انہوں نے جیل کے عملے پر زور دے کر کہا تھا کہ اس خبر کی تردید کی جائے۔ ان کا خیال تھا اس طرح یہ تاثر پیدا ہوگا کہ ان کے اعصاب ختم ہو چکے ہیں — انہیں قرآن مجید کا ایک نسخہ فراہم کیا گیا تھا مگر انہیں ایک بار بھی تلاوت کرتے نہیں دیکھا گیا۔

بہرحال جائے نماز اور تسبیح ان کے پاس پہنچا دی گئیں — لیکن انہوں نے جائے نماز کو ہاتھ تک نہیں لگایا، اور وہ اگلی صبح کو وہیں اور اسی حالت میں پڑی پائی گئی، جہاں کہ جیل کے عملے نے اُسے رکھا تھا۔ تسبیح، البتہ مسٹر بھٹو نے ہاتھ میں لی، لیکن کچھ پڑھنے یا ورد کرنے کے بجائے اُسے گلے میں ڈال لیا۔ یہ پھانسی کے بعد ان کے گلے سے اتاری گئی۔

جیل حکام نے انہیں شام کو یہ بھی کہا کہ وہ اپنی وصیت تیار کر لیں انہوں نے کاغذ اور قلم مانگا، اور لکھنا شروع کر دیا۔ دو صفحات لکھ چکے، تو پھر جانے کیا خیال آیا، باورچی خانے میں جا کر ان اوراق کو نذرِ آتش کر دیا۔ شاید ان پر ایک بار پھر یہ خیال غالب آگیا تھا کہ ان کے ساتھ ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے، اور اب یہ تحریر لکھوا کر ان کے اعصاب کی شکستگی کا اشتہار دینا مقصود ہے۔

رات کو ایک بج کر ۱۴ منٹ پر جیل کے عملے میں سے ایک ذمہ دار فرد ان کے سیل میں پہنچا اور بتایا گیا کہ ان کے نہانے کے لیے گرم پانی تیار کر دیا گیا ہے — یہ وہ لمحہ تھا، جب پہلی بار مسٹر بھٹو کو مکمل طور پر یقین ہوا کہ ان کی زندگی ختم ہونے والی ہے۔ انہوں نے دم سادھ لیا، اور ایسا لگا کہ وہ بے ہوش ہو گئے ہیں۔ اندیشہ ہوا کہ انہوں نے کوئی زہریلی چیز نہ کھا لی ہو یا ان کی زندگی کو نقصان نہ پہنچ گیا ہو۔ چنانچہ فوری طور پر ڈاکٹر کو بلایا گیا — ڈاکٹر نے ان کا معائنہ کیا۔ سٹیتھسکوپ سے سانس کی آواز سنی، آنکھوں کی پتلیوں کا جائزہ لیا اور بتایا کہ وہ ٹھیک ٹھاک ہیں، زندہ سلامت۔ پھر انہیں ہوش میں لایا گیا۔

پونے دو بجے سپرنٹنڈنٹ جیل نے انہیں موت کا وارنٹ پڑھ کر سُنایا۔ اب انہیں سو فیصد یقین کرنا پڑ گیا کہ معاملہ سیریس ہے، ان کی حالت دیدنی تھی، لیکن انہوں نے کہا مجھے وصیت لکھنی ہے، کاغذ چاہیئے۔ انہوں نے چائے پینے کی خواہش بھی ظاہر کی۔

انہیں بتایا گیا کہ اب وصیت کا مرحلہ گزر چکا ہے۔ شام کو انہوں نے اسے لکھنے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے اب یہ انتظام ممکن نہیں۔ مسٹر بھٹو میں کھڑا ہونے کی بھی ہمت نہیں تھی — انہوں نے نہانے سے بھی انکار کر دیا، جیل حکام کے لیے یہ ایک مایوس کن منظر تھا — وہ بھٹو سے حوصلے اور مضبوط اعصاب کی توقع رکھتے تھے، انہوں نے دیکھا تھا کہ آخری وقت پر پھانسی پانے والے بعض اخلاقی مجرم موت کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جاتے ہیں — عام طور پر وہ رقص کرتے ہوئے پھانسی کے پھندے تک پہنچتے ہیں، اور اسے چوم کر گلے میں ڈال لیتے ہیں۔ — پھانسی کے لیے دو بجے کا وقت مقرر کیا گیا تھا — اور اب دیر ہوتی جا رہی تھی۔ مسٹر بھٹو میں چلنے کی ہمت نہیں تھی، انہیں سٹریچر پر ڈالا گیا اور دو آدمیوں نے سٹریچر اٹھا لیا — مشکل یہ تھی وہ کبھی دائیں لڑھک جاتے اور کبھی بائیں — آخر کار سٹریچر کو چاروں طرف سے پکڑا گیا اور یوں سابقہ وزیرِاعظم پھانسی کے تختے کی طرف چلے اس چبوترے کے پاس پہنچ کر جہاں انہیں پھانسی دی جانی تھی، سٹریچر رکھ دیا گیا۔ انہیں اٹھنے کے لیے کہا گیا اور مسٹر بھٹو اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت انہوں نے اپنی بیوی کو یاد کیا اور مدھم آواز میں یہ الفاظ سُنے گئے:

"AM SORRY FOR MY WIFE SHE WILL BE LEFT ALONE"

ان کے ہاتھ پیچھے لے جا کر باندھ دیے گئے — انہوں نے قدم آگے بڑھایا اور خود کلامی کے انداز میں دھیرے سے کہا: "یہ ذرا مجھے تکلیف دیتا ہے" — ان کا اشارہ ہاتھ میں بندھی ہوئی رسی کی طرف تھا — جلاد لپک کر آگے بڑھا اور اس نے رسی ڈھیلی کر دی۔

مقررہ وقت سے چار منٹ اُوپر ہو چکے تھے، مسٹر بھٹو کے چہرے پر کالا نقاب چڑھا دیا گیا اور اب تختہ دار کھینچنے میں چند ساعتیں باقی تھیں، انہوں نے انتہائی کمزور آواز میں کہا: "FINISH 9T" یہ آخری الفاظ تھے، جو ان کے منہ سے نکلے اور سُنے گئے — دو بجکر پانچ منٹ ہو چکے تھے، جلاد کا ہاتھ آگے بڑھا — مسٹر بھٹو کی گردن پر رسی تنگ ہوتی گئی، اب وہ اس دنیا میں نہیں تھے۔

●●

* نمازِ جنازہ پڑھنے والوں میں پٹرول کی بوتلیں تقسیم کی گئیں
* پُراسرار نوجوان ہجوم کو مشتعل کرنے میں کامیاب ہو گیا
* پولیس تماشہ دیکھ رہی تھی تب پنجاب یونیورسٹی یونین نے اعلان کیا..



بھٹو کی یاد میں "سیاپا" ۔ ہائے ہائے اور جنازہ

نمائندہ خصوصی

۵ اپریل

دن کا ایک بجا ہے۔ یہ لاہور کا ناصر باغ ہے، جہاں گیارہ سال پہلے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے پہلی بار لاہور کے عوام کو مخاطب کیا تھا۔ جہاں پہلی بار ایوب حکومت نے ان کا جلسہ الٹنے کی کوشش کی اور وہ اپنی جان بچانے کے لیے ایک رکشے میں سوار ہو کر نکل بھاگے تھے۔ آج پیپلز پارٹی کے کارکن اپنے لیڈر کا سوگ منانے، اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کرنے کے لیے جمع ہونے والے ہیں، جسے ۵۰ گھنٹے قبل راولپنڈی جیل میں پھانسی دے دی گئی۔

پندرہ بیس خواتین شاہراہِ قائدِ اعظم کے دروازے سے باغ میں داخل ہوئیں۔ کچھ جیالے کارکن بھی باغ کے آہنی جنگلوں کو پھلانگ کر اندر داخل ہو رہے ہیں کیونکہ پولیس بڑے دروازے پر ان کی راہ میں حائل ہو رہی ہے۔ وہ ایک جگہ جمع ہو گئے، اور انہوں نے قرآن خوانی شروع کر دی ہے۔ قریب کھڑے ہوئے چند کارکن حکومت کو گالیاں دے رہے ہیں، سینہ کوبی بھی جاری ہے۔ دوسرے کے تنگ جھنگ کا رکن ایک اور گرجتے ہیں "ظالمو جواب دو۔ خون کا حساب دو" اور "انتقام، انتقام" کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔ "قرآن خوانی" میں مصروف افراد انہیں بار بار منع کر رہے ہیں۔ "ایک دائرہ بنا لیجئے اور کلمہ طیبہ کا ورد کیجئے"۔

دو بج رہے ہیں ایک معمر خاتون باغ میں سینہ کوبی کرتے کرتے بے ہوش کر گر پڑی۔ اسے ہوش میں لانے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ حیرت انگیز طور پر وہ چند ہی لمحوں کے اندر ہوش میں آ گئی، اور اس نے پولیس سے مخاطب ہو کر چلّا کر کہا: "ظالمو! مجھے بھی گولی مار دو"۔ ایک طرف سے آواز ابھری "اب بھٹو کے لیے غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی" دوسری طرف سے جواب آیا "نہیں! نہیں!! ابھی ہمارے لیڈر نہیں پہنچے ——— پونے تین بج گئے۔ ملک سعید حسن کی پیلے رنگ کی مزدا کار باغ میں داخل ہو رہی ہے ——— اس وقت باغ میں تین ہزار افراد موجود ہیں۔ کارکنوں میں جوش کی لہر اٹھی اور نعروں کی آواز بلند ہو گئی "شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے"۔

کارکن ملک سعید حسن کے گرد اکٹھے ہو چکے ہیں اور وہ ان سے مخاطب ہیں: "آپ کے دلوں میں جو غم و غصہ ہے میں اس سے واقف ہوں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس غم و غصے کو تنظیم میں بدل دیں۔ میرا عظیم قائد غریبوں کے حقوق کی جنگ لڑتا ہوا شہید ہو گیا ——— اس نے کہا تھا جب تک پاکستان میں ایک بھی غریب زندہ ہے، بھٹو مر نہیں سکتا۔ آج کے اس اجتماع میں یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ بھٹو زندہ ہے لوگ کہتے تھے کہ جب بھٹو ختم ہو جائے گا، تو پیپلز پارٹی بھی ختم ہو جائے گی میرے قائد کی بات سچی نکلی، اور ان ظالموں کی بات جھوٹ ثابت ہوئی"۔ کارکن اظہارِ مسرت کے لیے تالیاں بجا رہے ہیں۔ کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے وہ تالیاں بجانے والوں سے کہہ رہے ہیں: "تالیاں نہ بجاؤ کلمہ پڑھو" مگر تالیاں برابر بج رہی ہیں۔

ملک سعید حسن ہجوم پر قابو پانے کی ناکام کوشش کے بعد اچانک اعلان کرتے ہیں ——— "اب نمازِ جنازہ ہو گی" ——— "نہیں، نہیں!" اجتماع سے آواز ابھرتی ہیں "نماز نہیں تقریر!" ——— اور ملک سعید نے

تقریر شروع کر دی ہے: "میں حکومت وقت کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم بھٹو کی جان لینے والوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ ہر شخص، ہر غریب شخص بھٹو کی خاطر اپنی جان قربان کر دے گا۔"

پونے چار بج رہے ہیں۔ اعلان ہوتا ہے "نماز جنازہ کیلئے صفیں درست کر لی جائیں"۔ لوگ سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔ وہ نماز جنازہ پڑھنے پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ عورتوں نے اچانک "ہائے" کے نعرے لگانا شروع کر دیے ہیں ___ مگر آخرکار لوگ نماز جنازہ کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ آٹھ دس نوجوانوں کا ایک گروپ نماز سے لاتعلق رہتا ہے ___ جنازہ ہو چکا۔ امام نے حاضرین سے کہا: "دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ"۔ وہ لاتعلق نوجوان بھی نمازیوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اچانک وہ اپنی شلواروں، قمیضوں اور زیر جاموں سے جلی حروف میں تحریر کیے ہوئے کچھ بینر نکال لیتے ہیں۔ ان بینروں پر "سرخ انقلاب" کے نعرے ہیں۔ اور گالیاں لکھی ہوئی ہیں۔ کارکن انہیں صبر کی تلقین کر رہے ہیں کہ بینروں کی نمائش سے پہلے انہیں دعا تو مانگ لینے دو، مگر نوجوان بے تاب ہو رہے ہیں۔ امام نے دُعا شروع کی۔ حاضرین میں سے بیشتر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سرخ نوجوانوں کا گروپ چپکے چپکے چند لمحے پہلے مجمع سے الگ ہوا تھا، پھر ان میں شامل ہو رہا ہے۔ عورتیں برابر سینہ کوبی کر رہی ہیں

ملک سعید حسن کی کار شاہراہ قائد اعظم کی طرف بڑھی ___ شاہراہ قائد اعظم سے وہ لوئر مال پر آ گئے۔ ضلع کچہری کے قریب پہنچے، تو پیپلز پارٹی کے چند پُرجوش نوجوانوں نے ان کی کار کو گھیر کر انہیں باہر آنے کو کہا: وہ بلا تامل باہر آ گئے۔ ان کی قیادت میں ایک بے ترتیب جلوس ترتیب پاتا ہے۔ شرکائے جلوس کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ ہے۔ سامنے کچہری کے نزدیک ایک مجمع میں ایک ڈیڑھ درجن خواتین سیاپا کر رہی ہیں۔ ملک سعید حسن کے گرد جمع ہونے والے نوجوان اچانک مشتعل ہو گئے انہوں نے مسافروں سے بھری ایک ویگن کو گھیر لیا ہے اس پر پتھر پھینکے ___ ایک رکشہ بھی ان کے ہتھے چڑھ گیا ہے، مگر وہ چند چندہ وصول کر کے پیچھا چھڑاتا ہے۔

سوا چار بج گئے۔ جلوس ضلع کچہری والے چوک میں پہنچ گیا ہے۔ وہاں سے ملک سعید حسن کار میں سوار ہو کر واپس روانہ ہو گئے ___ جلوس اب مختلف گروہوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک ٹولی ضلع کچہری اور سیکرٹریٹ کے درمیان پولیس پر مسلسل پتھر پھینک رہی ہے۔ پولیس والے جوابی کارروائی نہیں کر رہے۔ ضلع کچہری کے سامنے کھڑے دو سو کے قریب نوجوان اچانک یہ نعرہ لگاتے ہوئے کہ "چلو چلو داتا صاحب چلو" مگر انہوں نے داتا صاحب جانے کے بجائے کچہری میں داخل ہو کر وکلاء کے چیمبرز کو آگ لگا دی۔ چند مشتعل نوجوانوں نے سامنے سے آنے والی سرخ رنگ کی ایک کار جی ٹی ۱۹۳۱ کو روک لیا ہے اور ڈرائیور کو اتار کر اس پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی ہے ___ پولیس پہلی بار حرکت میں آئی ہے۔ اس نے مجمع کو منتشر کرنے کے لیے آنسو گیس کے گولے پھینکنا شروع کر دیے

مشتعل مظاہرین مین بازار سے داتا دربار کی طرف مڑتے ہیں۔ چند قدم دور انہوں نے دو پرائیویٹ کاروں ایل ای ای ۸۲۳۸ اور ایل ای ایم ۳۲۲۲ کو نذر آتش کر دیا ہے۔ انہی نوجوانوں نے "ملک تھیٹر" کے سامنے پولیس کی ایک موٹر سائیکل ایل ای او ۵۵۲۵ کو بھی آگ لگا دی ___ پولیس نوجوانوں کی اس کارروائی میں مزاحم نہیں ہو رہی ہے، خاموشی سے تماشا دیکھ رہی ہے۔ چوک بھاٹی میں مظاہرین نے ایک اومنی بس ایل ای بی ۱۵۰۰ کو آگ لگا دی۔ اسی چوک میں بس پر سے گزرنے والے بجلی کے تار کاٹ دیے۔ پولیس گاڑیوں پر اس دوران سنگباری جاری رہتی ہے۔ ایک ڈیوٹی مجسٹریٹ کو بھی زخم آئے۔ مگر پولیس جوابی کارروائی پر آمادہ نظر نہیں آتی۔

شام کے پانچ بج رہے ہیں۔ جلوس بتدریج منتشر ہو رہا ہے۔ دو عورتیں سرکلر روڈ پر نمودار ہوئیں، وہ راہگیروں کو روک رہی ہیں۔ ان میں سے ایک نے ایک سکوٹر سوار کی عینک اتار لی۔ دوسرے کی جیب سے کچھ نقدی نکال لی اور چیخ کر کہا: "مرد اب بے غیرت ہو گئے ہیں، انہیں اپنے ہاتھوں میں چوڑیاں پہن لینی چاہئیں"۔ ہنگامہ کرنے والے نوجوان اب یہاں جمع ہو گئے ہیں ___ عورتیں حکومت کو گالیاں دے رہی ہیں

پولیس کی ایک ویگن ہجوم کے قریب پہنچ گئی، جس کا رخ داتا دربار کی طرف ہے۔ پولیس والوں نے آنسو گیس کے گولے پھینکے اور کچھ کو موقع پر پکڑ لیا ہے، باقی ارد گرد گلیوں میں چھپ جاتے ہیں۔ دونوں مذکورہ عورتیں ایک تانگے میں سوار ہو گئی ہیں ___ ان کا رخ شاہی محلے کی طرف ہے۔

ناصر باغ میں اعلان کیا گیا تھا کہ سب کارکن پانچ بجے داتا دربار پہنچ جائیں، وہاں دعا مانگی جائے گی، مگر اب سوا پانچ بج رہے ہیں اور ایک بھی کارکن داتا دربار نہیں پہنچا۔ ایک پولیس انسپکٹر وائرلیس پر اپنے ہیڈ کوارٹر کو پیغام دے رہا ہے "شہر میں اب مکمل طور پر امن و امان ہے۔ ہر جگہ گاڑیوں کی آمد و رفت بحال ہو گئی ہے"۔



عظیم الشان ماتمی جلوس مال روڈ پر

۶ اپریل

کل ناصر باغ میں اعلان کیا گیا تھا کہ آج باغ میں ڈھائی بجے مسٹر بھٹو کے لیے قل خوانی ہوگی۔ پونے ایک بجے نوابزادہ مظہر علی خان کی اہلیہ طاہرہ مظہر علی خان کی قیادت میں تیس چالیس عورتیں ناصر باغ کے باہر پہنچ گئیں ___ پولیس انہیں اندر جانے سے منع کر رہی ہے۔ وہ شاہراہ قائد اعظم والے دروازے کے قریب دھرنا مار کر بیٹھ گئی ہیں۔ چند نوجوان خواتین جو طالبات لگتی ہیں، قرآن حکیم کی تلاوت کر رہی ہیں، جب کہ چند دوسری خواتین مخصوص لہجے میں حکومت کو گالیاں دے رہی ہیں، ایک عورت نے مردانہ لہجے میں پکار کر کہا: "مر گیا جو ہمارا سب کچھ تھا، اور اب ہمارا کچھ نہیں رہا"۔ تین موٹر سائیکلوں پر سوار نوجوان عورتوں



سوئی گیس کا سب سٹیشن اور مساوات پارٹی کا دفتر



طالب علموں کا جوابی جلوس ۔ "آج کے بعد کوئی ہنگامہ نہیں ہونا چاہیئے" ۔

کے قریب پہنچے، ان میں سے ایک روزنامہ "مساوات" کا فوٹوگرافر تھا۔ ایک پورٹریٹ وہ اپنے موٹر سائیکلوں سے اُترے۔ ان میں سے شیشیوں میں بھرا کچھ پٹرول نکالا اور عورتوں کے حوالے کردیا ـــــ عورتیں اپنے دوپٹے اس پٹرول میں بھگو رہی ہیں ـــــ یکایک وہ، سنٹرل چوک کی طرف بھاگ کھڑی ہوتی ہیں، اور وہاں رکھی ہوئی توپ پر دوپٹے ڈال کر اسے نذر آتش کرنے کی کوشش کررہی ہیں ـــــ قدیم یادگاری توپ پر اس آگ کا کوئی اثر نہیں ہوتا ـــــ وہ مایوس ہوکر واپس آجاتی ہیں۔

سوا ایک بج گیا، پانچ موٹر سائیکل سوار اور پانچ سکوٹر سوار ہجوم کے قریب پہنچے، ان میں سے زیادہ تر چہرے وہی ہیں جو کل غائبانہ نماز جنازہ میں سرخ انقلاب کے نعروں پر مشتمل بینرز کے آئے تھے۔ ان نوجوانوں نے عورتوں کے قریب سکوٹر اور موٹر سائیکل روک لیے روزنامہ مساوات" کا فوٹوگرافر اور ایک غیر ملکی اخبار نویس ان نوجوانوں کی تصاویر بنا رہے ہیں۔ گردونواح سے پیپلز پارٹی کے کارکن جو مختلف گروپوں میں ادھر ادھر کھڑے تھے، وہاں جمع ہونا شروع ہوگئے، کارکنوں نے نعرہ لگایا: ..... "ہائے ہائے"۔

موٹر سائیکل سواروں کے سکواڈ کے لیڈر نے اعلان کیا:

"ہم مینار پاکستان جا رہے ہیں" ـــــ اور وہ روانہ ہو جاتے ہیں۔ پندرہ منٹ کے بعد پولیس حکام اور اہلکاروں کی ایک جیپ اور ویگن ان کے پیچھے روانہ ہوتی ہے۔ پتہ چلا ہے کہ اس سکواڈ نے مینار پاکستان کے قریب ایک پرائیویٹ ویگن اور جی ٹی ایس کی ایک بس کو آگ لگا دی ہے جو اسلام آباد سے لاہور آرہی تھی، تھوڑی دیر میں نوجوانوں کا یہ گروہ واپس ناصر باغ پہنچ جاتا ہے۔

ایک بج کر چالیس منٹ ہو رہے ہیں۔ موٹر سائیکل سواروں کی ٹولی نے اعلان کیا "ہم اچھرہ جا رہے ہیں" ـــــ پیپلز پارٹی کی عورتوں نے نعرے لگائے: "ہمیں مودودی کا سر چاہیئے، ہمیں مفتی کا سر چاہیئے"۔ ایک خاتون کارکن نے روتے ہوئے لہجے میں کہا "جا بیدار ہاتھی کو پھانسی پر لٹکا دیتے، ہمارے بھٹو کو کیوں لٹکا دیا؟"

سکوٹر اور موٹر سائیکل سواروں کا دستہ سیکرٹریٹ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ وہاں پیپلز پارٹی کے کچھ کارکن بھی جمع ہیں ـــــ مختصر ہجوم سیکرٹریٹ میں گھس کر توڑ پھوڑ کی کوشش کر رہا ہے، مگر پہرے پر موجود گارڈ نے فائرنگ کردی، ایک لڑکا معمولی زخمی ہو گیا ـــــ ہجوم چوبرجی کی طرف بھاگ نکلا ہے۔ اس نے سیکرٹریٹ سے چند گز کے فاصلے پر سڑک کے دائیں، بائیں دو پٹرول پمپوں کو نذر آتش کر دیا ہے۔ یہاں پولیس کی ایک گاڑی بھی موجود ہے۔ اس گاڑی میں پچاس کے قریب پولیس والے موجود ہیں، جو نہایت اطمینان کے ساتھ آتش زنی کی وارداتیں دیکھ رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے سڑک پر کھڑی نیلے رنگ کی ایک ڈاٹسن کار کو بھی پٹرول چھڑک کر نذر آتش کر دیا۔

ایک بج کر پچاس منٹ ہو گئے۔ آگ لگانے والا دستہ ایم اے او کالج کے قریب پہنچ گیا ہے۔ انہوں نے پاکستان مساوات پارٹی کے مرکزی دفتر پر تیل چھڑک کر آگ لگا رہا ہے۔ یہ وہی دفتر ہے، جس پر چند ماہ پہلے حملہ ہوا، تو حنیف رامے نے جماعت اسلامی کو اس کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ ایک نوجوان چھت پر چڑھ گیا ہے اور اس نے سوئی گیس کی پائپ لائن کھول دی۔ کسی نے گیس کو آگ لگا دی ہے۔ شعلے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ راہ گیروں کے لیے یہ ایک خوفزدہ کر دینے والا منظر ہے۔ اب پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے چہروں پر رونق کے آثار دیکھے جا سکتے ہیں۔

ایک بج کر پچپن منٹ پر یہ دستہ دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، ایک جین مندر کی طرف اور دوسرا چوبرجی کی طرف روانہ ہو رہا ہے۔ دوسرے دستے نے چوبرجی کے قریب ایک پرائیویٹ کار کو آگ لگا دی اور مدرسۃ البنات کی طرف سے جین مندر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ راستے میں دو مزید پرائیویٹ گاڑیوں کو آگ لگا دی گئی ہے، جب کہ ان کے ساتھی وہاں جین مندر میں واقع پٹرول پمپ سے جبراً پٹرول حاصل کر چکے ہیں ـــــ یہاں ایک بار پھر دونوں دستے اکٹھے ہو جاتے ہیں، اسی دوران پیپلز پارٹی کے بعض کارکن لٹن روڈ پر جا بجا ٹائر رکھ کر انہیں آگ لگا چکے ہیں۔ موٹر سائیکل سواروں نے لٹن روڈ پر اچھرہ کی راہ لی اور راستے میں تین گاڑیاں اور ایک رکشے کو چند منٹ کے اندر اندر آگ کے شعلوں کے سپرد کر دیا۔

دو بج کر پانچ منٹ ہو رہے ہیں۔ آتش زن دستے نے مزنگ اڈے کے قریب ایک بس گاڑی کو آگ لگا دی۔ دستہ اچھرہ کی طرف روانہ ہوا، مزنگ چونگی سے ذرا آگے اس نے ایک کار پر پتھر پھینک کر اس کے شیشے توڑ دیے۔ کار ڈرائیور نے ان کا تعاقب کر کے دو سکوٹر سواروں کو پکڑ لیا، ارد گرد کے دکاندار بھی وہاں پہنچ گئے، اور ہنگامہ کرنے والے لڑکوں کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا جو خاموشی سے تماشا دیکھ رہی تھی۔

دہشت گردی کی اس فضا میں مزنگ کے علاقے کی تمام دکانیں بند ہو گئی ہیں، عورتیں، بچے، بوڑھے جوان اپنے گھروں سے باہر نکل آئے ہیں۔ سوا دو بجے کے قریب مزنگ پولیس نے وائرلیس کے ذریعے اعلیٰ حکام سے التجا کی کہ لٹن روڈ پر پولیس کی مزید نفری



جیالی کارکن اور جیالا کارکن

در کار ہے۔ چند لمحوں کے بعد وہاں پولیس کی چار بڑی گاڑیاں پہنچ جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ آنسو گیس پھینکنے والی دو گاڑیاں بھی موجود ہیں۔ اب ان گاڑیوں سے مزنگ کی تمام گلیوں تک میں آنسو گیس کے گولے پھینکے جا رہے ہیں۔ مظاہرین پولیس پر پتھر پھینک رہے ہیں۔ پولیس اہل کاروں نے سنگباری کرنے والوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے فائرنگ کے انداز میں پوزیشن سنبھالی۔ ایک اعلیٰ افسر نے وارننگ دی: "سب لوگ منتشر ہو جائیں، ورنہ گولی چلا دی جائے گی۔" ہنگامہ کرنے والے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ جو بھاگ نہیں سکے، انہیں پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔

تین بج گئے۔ ناصر باغ کے بڑے دروازے پر پیپلز پارٹی کی عورتیں ابھی دھرنا مارے بیٹھی ہیں۔ وہ بھی کبھی کبھار پولیس کے گارڈوں پر پتھراؤ، انہیں جھڑکتی ہیں۔ پرائیویٹ گاڑیوں کو روک لیتی ہیں اور ان پر بھی سنگباری کرتی ہیں۔ پولیس کے ایک اعلیٰ افسر نے ان سے التجا کی "ہم آپ کا احترام کرتے ہیں۔ آپ منتشر ہو جائیں۔" بیگم طاہرہ مظہر علی خاں پولیس والوں سے مخاطب ہو کر چیخیں "دفع ہو جاؤ۔" اس کے ساتھ ہی انہوں نے عورتوں سے خطاب کرنا شروع کر دیا "ہم یہاں سے نہیں جائیں گی، مردوں نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔ موجودہ آمر حکمرانوں کو ہم عورتیں ہی برطرف کریں گی۔ آج ہم پر تشدد کیا جا رہا ہے۔ کہاں ہیں وہ لوگ جو چادر اور چار دیواری کی حفاظت کی باتیں کرتے تھے؟"

دس بج کر دو منٹ ہو گئے۔ سیکرٹریٹ کے عقب سے اچانک ایک جلوس برآمد ہوتا ہے جو نعرے بھی چلا رہا ہے۔ شرکائے جلوس نے کسٹمز آفس کو نذرِ آتش کر دیا اور حکومت کے خلاف نعرے لگاتا ہوا عورتوں کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ صحافیوں کی ایک ٹولی عجائب گھر کی عمارت میں موجود ہے۔ ان کے پیچھے پولیس والے بھی آ رہے ہیں اور انہیں حراست میں لے لیتے ہیں۔ ان پر ایک پولیس وین کو نذرِ آتش کرنے کی کوششوں کا الزام ہے۔

تقریباً پونے چار بجے مال روڈ پر موجود پیپلز پارٹی کی خواتین اور مردوں نے اچانک اخباری رپورٹروں پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ کچھ مظاہرین عجائب گھر کے احاطہ میں داخل ہو گئے اور انہوں نے رپورٹروں کو گالیاں دیتے، انہیں پولیس کا ٹاؤٹ قرار دیتے ہوئے ایک موٹر سائیکل کو نذرِ آتش کرنے کی کوشش کی۔ ایک آواز آئی "یہ تو مساوات والے کی گاڑی ہے" اور آگ لگانے والے کے بڑھتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔

تھانہ ٹبی کے علاقے میں جہاں کبھی راتیں جاگتی تھیں اور دن سویا کرتے تھے اور اب راتیں بھی دنوں کی طرح ویران ہیں، آج صبح ہی سے آہ و بکا کا سلسلہ جاری ہے۔ ڈیڑھ بجے کے قریب جب وہاں سے موٹر سائیکل سواروں کا آتش زن دستہ گزرتا ہے، محلے کے لوگ جلوس کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مشتعل مظاہرین نے ایک پرائیویٹ وین کو آگ لگا دی اور شاہی قلعہ کے اندر ایک عمارت بھی نذرِ آتش کر دی۔ پولیس نے تین افراد گرفتار کر لیے ہیں جن میں سے ایک کو دوسرے افراد نے جبراً آزاد کرا لیا۔ رات گئے تک مشتعل افراد نے تھانہ ٹبی کا محاصرہ کیے رکھا اور وہ کبھی کبھار تھانے پر سنگ باری کرتے رہے۔ وہ دونوں گرفتار شدگان کی رہائی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

۷، اپریل

آج ہنگامہ کرنے والوں نے ڈھائی بجے سہ پہر کو ناصر باغ میں جمع ہونے کا اعلان کر رکھا ہے۔ پونے ایک بجے دو درجن کے قریب عورتیں ناصر باغ کے دروازے پر پہنچ گئیں جہاں ان کے لیے حکام نے زنانہ پولیس تعینات کر رکھی ہے۔ پیپلز پارٹی کی کارکن عورتیں باغ کے ارد گرد بس شاپوں پر بیٹھی ہیں۔ ایک بجنے کو ہے۔ پیپلز پارٹی کے چند جیالے شاہراہ قائداعظم کے جناح ہال کے سامنے جمع ہو رہے ہیں۔ عورتیں بھی اس طرف لپک رہی ہیں۔ پولیس نے ہجوم پر ہلکا لاٹھی چارج کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں لوگ بھاگ نکلے۔ زنانہ پولیس نے دس عورتوں کو حراست میں لے لیا ہے۔ ان میں سے ایک التجا کر رہی ہے: "خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو، میرا ایک سال کا شیر خوار بچہ گھر میں رہ گیا ہے۔" پولیس افسر نے رحم آمیز نگاہوں سے دیکھا اور اسے رہا کرنے کا حکم دے دیا۔

٭ ٭ ٭

پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں صبح کے دس بجے ہیں۔ سٹوڈنٹس یونین کے طلبہ اور قومی اتحاد کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے یونین کے صدر ملک اختر جاوید اور اسلامی جمعیت طلبہ پنجاب کے صدر حافظ سلمان بٹ اعلان کر رہے ہیں کہ آج سے طالب علم پر امن شہریوں کی حفاظت کریں گے اور پیپلز پارٹی کی غنڈہ گردی برداشت نہیں کریں گے۔ ایک ہزار کے لگ بھگ طالب علم سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ وہ جنرل ضیاء الحق اور اسلامی نظام کے حق میں نعرے بلند کر رہے ہیں۔ جلوس بھاٹی گیٹ، لوہاری گیٹ، سرکلر روڈ، نئی انارکلی، پرانی انارکلی اور جین مندر سے ہوتا ہوا چوبرجی پہنچ گیا ـــــ طلبہ اور قومی اتحاد کے کارکن پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس، عجائب گھر، چوک استنبول اور دوسرے اہم مقامات پر پہرہ دیتے رہے، تاکہ کوئی تخریبی کارروائی نہ ہونے پائے۔

شام ساڑھے پانچ بجے وہ ایک بار پھر اکٹھے ہو رہے ہیں۔ مال روڈ پر سے گزرتے ہوئے وہ مسجد شہداء کی طرف جا رہے ہیں۔ بعض دکانداروں نے دور سے جلوس آتے دیکھ کر اپنی دکانیں بند کرنا شروع کر دیں۔ جلوس بند دکانوں کے قریب پہنچا، اور ان کے بیڈ کا رڈ لا رہا ہے ہیں کہ وہ تو ان کی حفاظت کے لیے آئے ہیں۔ سورج ڈوب رہا ہے۔ طلبہ نے مسجد شہداء میں نماز مغرب ادا کی، اور اعلان کیا کہ وہ شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے مستعد رہیں گے ـــــ



ملک جاوید اختر قومی اتحاد کے کارکنوں سے خطاب کر رہے ہیں